ماہنامہ

قلندر شعور

دسمبر ۲۰۲۵ء

سُکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور رُوح کے عرفان کے بغیر سُکون نہیں مِلتا

اللہ کی بہترین صنّاعی

انسان

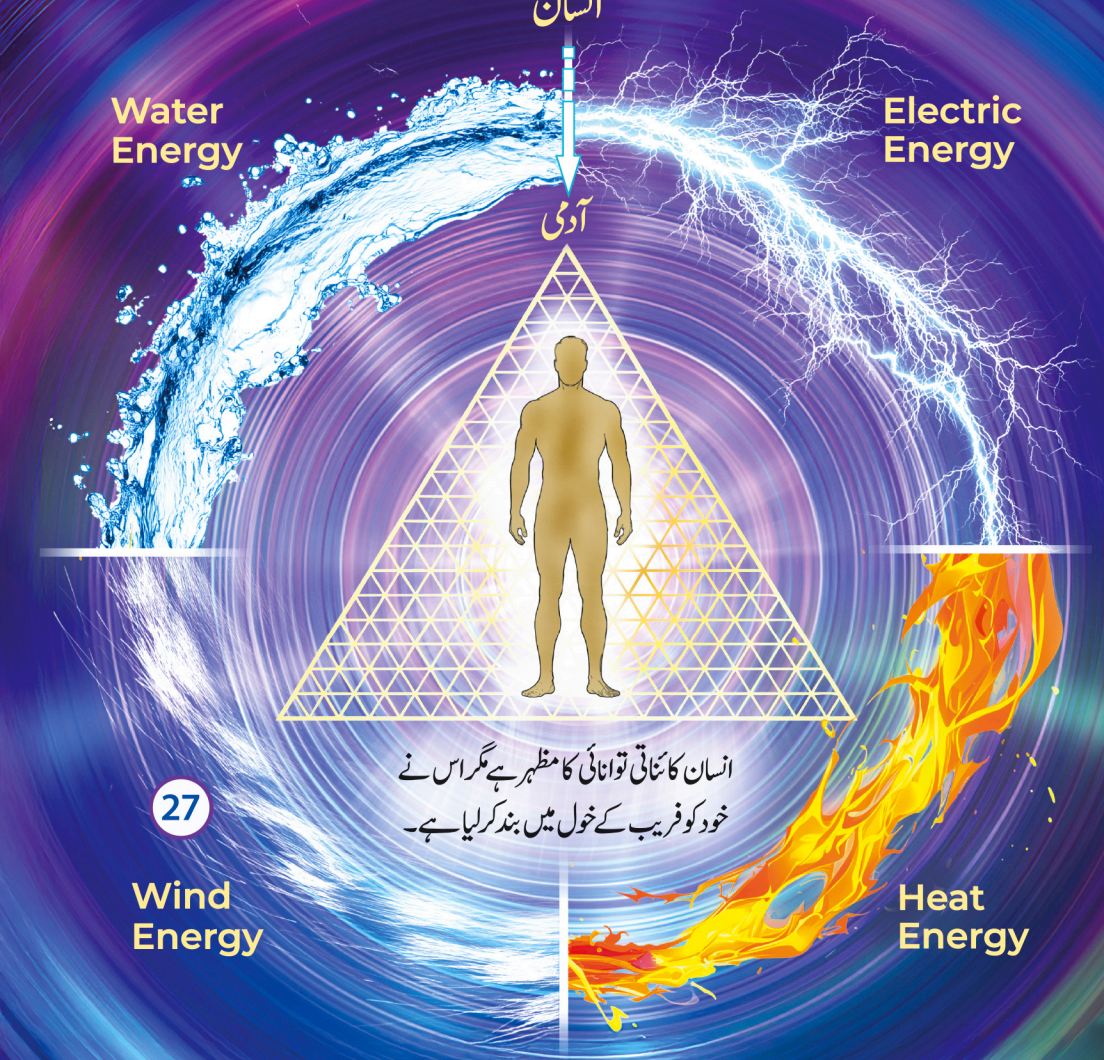

انسان کائناتی توانائی کا مظہر ہے مگر اس نے
خود کو فریب کے خول میں بند کرلیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب راضی
سب راضی

جلد 13 شمارہ 11 | دسمبر 2025ء | جمادی الثّانی ــ رجب 1447ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

قلندر شعور

کراچی

Neutral Thinking

(اردو ــ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی رحمۃ اللہ علیہ

ایڈیٹر

عائشہ خان

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

باہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 140 روپے ....سالانہ ہدیہ 2100 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 75 امریکی ڈالر سالانہ

B-113، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 213(0) 92+

۲۷ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ــــــــــــــــ حفیظ تائبؔ 6

نعت رسول مقبول ﷺ ــــــــــــــــ حفیظ تائبؔ 7

رباعیات ــــــــــــــــ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ 8

آج کی بات ــــــــــــــــ مدیر مسئول 10

فقیر کی ڈاک ــــــــــــــــ ادارہ 14

نامے میرے نام ــــــــــــــــ خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ 17

ہنوز لاہور دور است ــــــــــــــــ ملک محمد ناصر 21

سکون کا راز ــــــــــــــــ (M.A.Fine Arts) حامد ابراہیم 27

میں کون ہوں ـــ؟ ــــــــــــــــ (Ph.D.) ڈاکٹر سعیدہ شفیق میمن 33

شرح نظریۂ رنگ و نور | جسم اور روح ــــــــــــــــ خواجہ شمس الدین عظیمیؒ 37

پتّوں کا ایثار ــــــــــــــــ نفیسہ شاکر 43

روبوٹ نے انڈا پکڑنا سیکھا ــــــــــــــــ خورشید احمد 47

زندگی کا ساز ــــــــــــــــ (B.S Physics) جویریہ یٰسین 53

اک نور کی دنیا ہے کہیں پر آباد ______ (Ph.D.) ڈاکٹر نعیم ظفر 57

سلطان الہند ______ انیسہ عرفان 63

رلیینہ ـــ صحرا کی شہزادی ______ اسپین (MBBS) ڈاکٹر مکاشفہ نعیم 73

قریب دور ـــ دور قریب ______ عبداللہ 79

دریا میں کشتیاں ـــ؟ ______ عابد محمود 85

بارہ مسالے کی چاٹ ______ اشرف صبوحی 89

سرورق کی تشریح اکتوبر 2025ء | مینا ہے جہاں وہیں قیام اپنا ہے ______ قارئین 95

کورشِ اعظم ______ (M.Sc. Applied Physics) محمد عدنان خان 99

مثنوی مولانا رومؒ | فقر میرا فخر ہے ______ مترجم: قاضی سجاد حسین 107

آپ کے خواب اوران کی تعبیر ______ عظیمی خواجہ شمس الدینؒ 113

123 Gul-e-Nasreen ______ In Tune with Time

128 Muhammad Usman ______ Green Returns to the Branches

133 . . . ______ Written by You

136 K. S. Azeemi ______ Message of the Day

حمد باری تعالیٰ

حفیظ تائبؔ

کس کا نظام راہ نما ہے افق افق
کس کا دوام گونج رہا ہے افق افق

شانِ جلال کس کی عیاں ہے جبل جبل
رنگِ جمال کس کا جما ہے افق افق

کس کے لیے نجوم بکف[1] ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کھلا ہے افق افق

کس کے لیے سرودِ صبا[2] ہے چمن چمن
کس کے لیے نمودِ ضیا ہے افق افق

مکتوم[3] کس کی موجِ کرم ہے صدف صدف
مرقوم کس کا حرفِ وفا ہے افق افق

کس کی طلب میں اہلِ محبت ہیں داغ داغ
کس کی ادا سے حشر بپا ہے افق افق

سوزاں ہے کس کی یاد میں تائبؔ نفس نفس
فرقت میں کس کی شعلہ نوا ہے افق افق

۱۔ ستاروں کا ہموار کی ہوئی راہوں پر چلنا ۲۔ صبح کی ہوا کا نغمہ ۳۔ چھپی ہوئی

نعت رسولِ مقبول ﷺ

حفیظ تائبؔ

منارِ[1] رشد و ہدایت، سحابِ رحمت وجود
مرے رسولؐ کا اسوہ، مرے نبیؐ کا وجود
طلوعِ مہرِ رسالتؐ، وداعِ ظلمتِ شب
مرے رسولؐ کی بعثت ہے صبحِ نو کی نمود
مرے حضورؐ کے در پر لگی ہے سب کی نگاہ
مرے نبیؐ سے ہے وابستہ خلق کی بہبود
نبیؐ کے دم سے روانی ہے نبضِ دوراں میں
نبیؐ کے عزم سے ہے پاش پاش سحرِ جمود
نبیؐ نے ضربتِ خُلقِ عظیم سے توڑے
کدورتوں کے طلسمات، رنگتوں کے قیود
خدائے پاک کے ممدوح اور مدح سرا
مرے نبیؐ ہیں بیک وقت حامد و محمود
مرے نبیؐ کی ضرورت ہے ہر جگہ، ہر دم
ہو عرصہ گاہِ قیامت، عدم ہو یا موجود
مرے نبیؐ کی ریاست میں ہیں سبھی تائبؔ
یہ بحر و بر، یہ خلا و ملا، یہ چرخِ کبود[2]

۱۔ روشنی دکھانے والا ۲۔ نیلا آسمان

سب مٹی کے ذرّات ہیں

ذرّات جبینِ زرفشاں بنتے ہیں
ذرّات ہی روئے مہوشاں بنتے ہیں
ذرّات ہی باعث ہیں کفِ سیمیں کا
ذرّات ہی پائے گلفشاں بنتے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تمہارے لئے زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی۔ اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔" (الانعام: ۲)

ہڈیوں کا ایک پنجرہ ہے جس کے اوپر گوشت کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ گوشت کی ان تہوں کو اعصاب نے کساہوا ہے۔ اعصاب کو مضبوط اور مستحکم کرنے اور ان کی بدصورتی کو خوب صورتی میں بدلنے کے لئے اس پورے انسانی پنجرے پر کھال کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ کھال کے اوپر نقش و نگار ہیں۔ جب یہ تصویر پوری ہوتی ہے اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے تو ہم اسے دلہن بناتے ہیں، ماتھے پر جھومر سجاتے ہیں، سنہرے زیورات اور جواہرات سے چہرے کو مزیّن کرتے ہیں۔ خوب صورت ہاتھوں کو اور زیادہ دلکش بنانے کے لئے ہیرے کی انگوٹھیاں پہناتے ہیں، چاند کی چاندنی میں ڈھلی ہوئی کلائیوں میں چوڑیاں ڈالتے ہیں، مانگ میں افشاں بھرتے ہیں اور جب ہم اس بنی سنوری دلہن کے انگ انگ میں جھومتی ہوئی جوانی اور شراب سے بھرے ہوئے سراپا کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ جس پیشانی کو زیورات سے سجایا ہے، وہ مٹی کے ذرّات ہیں۔ حسین و دلکش چہرہ بھی مٹی کے ذرّات سے بنا ہے۔ خوب صورت ہاتھ اور مخروطی انگلیوں میں بھی مٹی کے ذرّات کام کر رہے ہیں۔ لب و لعل جن کے کھلنے پر پھول بکھر جاتے ہیں، وہ بھی مٹی کے ذرّات ہیں۔ سب کے ذرّات بھی مٹی سے بنے ہوئے ہیں ایسے ذرّات جو مٹی میں تبدیل ہو کر پھر مٹی بن جاتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آدم اپنے آپ سے بے خبر ہے۔ وہ خود کو نہیں جانتا۔ اگر وہ خود کو جان لے، دیکھ لے تو اللہ کی صفتِ ربانیت کو پہچاننا آسان ہے اس لئے کہ اللہ کی تخلیق صفتِ ربانیت کا مظہر ہے۔

آج کی بات

ہر آدمی دیکھتا ہے مگر کیا دیکھتا ہے اور کہاں دیکھتا ہے—؟ جہاں دیکھتا ہے، وہاں دیکھنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں۔ اگر ذہن کی سمت ایک ہو تو دیکھنے کا یہ قانون ذہن کی اسکرین پر اس طرح منکشف ہو جاتا ہے کہ پھر لاشعور اور شعور کے درمیان "لا" کا فرق نہیں رہتا[1]

قارئین خواتین و حضرات! ایک منٹ کے لیے پلک جھپکے بغیر اندر میں دیکھئے۔ اندر میں دیکھنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ ہر شے انفرادی ہے لیکن ہر دوسری شے اجتماعی شعور ہے۔ اجتماعی شعور کو نظر انداز کرنے سے انفرادیت مرکزِ نگاہ بن جاتی ہے— ہر یونٹ الگ نظر آتا ہے لیکن تمام یونٹ اپنی نوع اور نوع کے افراد کا تسلسل ہیں اور تسلسل اپنے نقطۂ آغاز سے ربط میں ہوتا ہے۔ ایک آدمی یونٹ کو دیکھتا ہے اور دوسرا تسلسل کو۔ جو تسلسل کو دیکھتا ہے، اس کے لیے شے اور شے کی نوعی ابتدا کے درمیان فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔

•• ———— ••

دیکھنے کے میکانزم کو سمجھنے کے لیے کیمرا کھلی راہ نمائی کرتا ہے۔ کیمرے کی آنکھ نہیں دیکھ رہی لیکن— دیکھ رہی ہے۔ جب کیمرا یا کوئی بھی آنکھ پٹ کھولتی ہے اور بند کرتی ہے تو کیا یہ چھپی ہوئی روشنی کا مظاہرہ نہیں ہے—؟

دیکھنے کی طرزیں ہیں۔ آنکھوں کا میکانزم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اگر پلک نہ جھپکے تو آنکھوں کو نظر نہیں آئے گا۔ کیمرے کی مثال سے یہ لاینحل[2] مسئلہ آسان لفظوں

۱۔ لاشعور—شعور بن جاتا ہے۔ ۲۔ حل نہ ہونے والا

میں بیان ہوسکتا ہے۔ شعور کے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ آنکھ دیکھتی ہے۔
لیکن اگر آنکھ میں سرچ لائٹ نہ کھلے تو نظر نہیں دیکھتی ــــ
اور اگر کچھ اور دیکھتا ہے تو شعور کی حد بندی بیان نہیں کرسکتی۔

(مشق) وائٹ بورڈ کے بالکل بیچ میں ایک دائرہ بنایئے۔ دائرے کو چمکدار سیاہ روشنائی سے بھر دیجئے۔ پانچ فٹ کے فاصلے سے دائرے پر نظر جمایئے۔ نظر کا زاویہ اس طرح بنے کہ آنکھ کی پُتلی ــــ سیاہ رنگ کے دائرے پر پلک جھپکائے بغیر جمی رہے۔

اب تین منٹ کے لیے تفکر کیجئے اور پلکوں کو اوپر نیچے اس طرح ملا دیجئے جیسے جال بنتا ہے۔ بظاہر کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن پلکوں میں حرکت نہ ہونے کی وجہ سے آنکھ کے پیچھے گہرائی میں دماغ کے ایک یونٹ پر عکس نمودار ہوگا۔

عکس کو سمجھنے کے لیے مثال پر غور کیجئے۔

زید کو پیاس لگی۔ پیاس کے نقوش اگر نہ بنیں تو پیاس کی تکمیل نہیں ہوگی۔ کھلی آنکھ سے آنکھ کے تل پر عکس نمودار ہوتا ہے۔ نہ صرف نمودار ہوتا ہے، اس میں آئینے کی طرح دوسرے فرد کی تصویر نظر آتی ہے۔ اگر پلک جھپک جائے تو اندر میں بنی ہوئی تصویر اس طرح دھندلی ہوجائے گی کہ اس کو ہم نہ دیکھنے کا عمل سمجھیں گے جب کہ ایسا نہیں ہے۔

آنکھ کی خوب صورتی میں ایک بڑی خوب صورت تخلیق آنکھ کے اوپر نیچے دونوں کناروں پر پلکوں کا عمل قابلِ توجہ ہے۔ کیا آنکھ پر پڑنے والا عکس پلکوں کا ردِّعمل نہیں ہے؟ آپ دور قریب دیکھ رہے ہیں۔ اوپر نیچے دونوں پلکیں Positive, Negative ایک جگہ جمع کرلیجئے، کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن مراقبہ کی حالت میں بند آنکھوں سے یعنی پلکوں کے باہم یکجا ہونے سے زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

ہر ذی شعور مرد یا خاتون، جوان اور بزرگ ــــ دیکھنے کے میکانزم کو واضح طور پر سمجھنے

کے لیے کیمرے کی مثال سے مدد لے سکتا ہے۔ ایک پردہ ہے۔ اس پردے کے اوپر پلکوں کا ہلکا سا دباؤ ہے۔ ہلکے سے دباؤ سے جب اوپر نیچے کی پلکیں ایک دوسرے میں جذب ہو جاتی ہیں تو ہمیں کچھ نظر نہیں آتا لیکن ان دو رخوں، اوپر نیچے کی پلکوں کو الگ الگ کھول دیجئے۔ اب بہت کچھ نظر آئے گا یا نہیں آئے گا لیکن آئے گا۔ کیا پلک کا جھپکنا یا کیمرے کے شٹر کا گرنا یا کھلنا دیکھنے کے میکانزم کی نشاندہی نہیں ہے ــــ؟

ہم دیکھنے کی طرزوں سے اگر واقف ہونا چاہتے ہیں، طرزوں سے مراد میکانزم ہے تو توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ پہلے آنکھ کھلی ہوتی ہے، ارادی یا غیر ارادی طور پر آنکھ کے اندر تل پر تصویر نمایاں ہوتی ہے، اوپر نیچے کی دونوں پلکیں ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جاتی ہیں کہ دوئی نہیں رہتی اور آنکھ کے اندر دیکھنے کا عدسہ (لینس) کچھ نہیں دیکھتا لیکن جب پلکیں الگ ہو کر کھل بند ہوتی ہیں تو کھلنے اور بند ہونے کے درمیانی "وقفے" کو وہ دیکھنا سمجھتا ہے۔ یہ "وقفہ" ٹکڑوں میں بٹی ہوئی اسپیس ہے جس سے آدمی واقف ہے، اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جب پلکیں یکجان ہوتی ہیں یعنی آنکھ کے دونوں کناروں کا درمیانی وقفہ حذف ہو جاتا ہے تو وہ کچھ نظر آتا ہے جس میں نگاہ کسی جگہ کو خالی نہیں دیکھتی۔

• • ——————— • •

بہت ذہین، فہیم اور دانا بینا حضرات و خواتین ــــ مشق کیجئے۔

پیاس لگی ــــ تاکہ خشکی کی جگہ سیرابی کا ظہور ہو۔ آپ بالکل یکسو ہو کر دماغ کے اندر میں دیکھئے۔ پیاس (thirst) یعنی ضرورت ــــ یعنی سیرابی کی ضرورت کا ادراک جب گہرا ہو گا تو دماغ کے اندر پانی کے خط و خال ظاہر ہوں گے اور دماغ کے اندر اسکرین پر پانی کے نقوش ابھر جائیں گے اور یہ نقوش اتنے زیادہ نمایاں ہو جائیں گے کہ پیاسی مخلوق، پیاسا آدمی، پیاسے درخت، پیاسی زمین، برف پوش پہاڑ، زمین کے پردے میں چھپے ہوئے پانی کے چشمے ــــ دماغ کے لاشمار تصویر خانوں میں ایک خانہ کھلے گا اور اس میں آپ کو، مجھے،

درخت کو، پرندوں کو، حشرات الارض کو، آسمانی دنیاؤں کو — ہر شے کی جو آنکھ کی ریٹنا میں ہو، تصویر نظر آئے گی۔ اگر یہ تصویر دماغ کے اندر میں مظاہرہ نہ کرے تو فرد پانی نہیں پیے گا۔ نتیجے میں —؟

مخلوقات جب اپنی ہستی کا تذکرہ کرتی ہیں تو اس تذکرے میں دیکھنے، سننے، محسوس کرنے، سوتے ہوئے بینائی کا کھلنا اور جاگتے ہوئے بھی بینائی کا عکس نمودار نہ ہونا شامل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کسی خیال میں گم ہو جاتے ہیں اور اس کو بے خیال ہونا کہتے ہیں۔ بے خیال ہونے سے مراد خیال آنا، چھپنا اور دباؤ نہیں ہے۔ تجربہ کیجئے کہ پھر کیا ہے؟

خیال آنے پر ردِّعمل کا میکانزم یہ ہے کہ اگر فزیکل باڈی کسی ایک نقطہ پر متوجہ نہ ہو تو اس بات کو مثال سے سمجھئے — آدمی کو تشنگی دور کرنے کا خیال نہ آئے یعنی پیاس نہ لگے یا پیاس کا تقاضا ابھرے، شکل و صورت کے نقوش بنیں لیکن کٹورے یا گلاس میں پانی کی موجودگی نہ ہو تو وہ پانی نہیں پی سکتا۔ کیوں نہیں پی سکتا —؟ اس لیے نہیں پی سکتا کہ دماغ کے اندر پانی کی بنی ہوئی تصویر ظاہر ہونے کے باوجود اس کے اوپر دبیز پردے چھا جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں زندگی ختم تو ہو سکتی ہے لیکن —؟

باشعور دوستو! صد احترام بزرگو، خواتین و حضرات محقق (scientists) ! گھڑی دیکھ کر 120 سیکنڈ یکسو ہونے کی مشق کیجئے۔ ذہنی یکسوئی کی مشق کا نتیجہ یہ مرتب ہو گا کہ جو کچھ زید کرنا چاہتا ہے، اس کی طرف پوری توجہ سے تحقیق و تلاش میں مصروف ہو جائے گا۔

آپ نے جو پڑھا، یہ گہرے شعور کی باتیں ہیں جن کے کھلنے کے لیے ذہن کا ذہن سے یکجان ہونا ضروری ہے۔ بڑوں کو سلام — بچوں کو پیار۔

اللہ حافظ

خواجہ شمس الدین عظیمی

فقیر کی ڈاک

تفکر — ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی — عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔ "فقیر کی ڈاک" اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحبؒ نے شعور کے تانے بانے کو لاشعور سے جوڑ دیا ہے۔

محترم ومکرم عظیمی صاحب — السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

بھائی کے دماغ میں یہ بات نقش ہوگئی ہے کہ اگر وہ گھر سے باہر نکلیں گے تو ان کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ نتیجے میں انہوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ ایکسیڈنٹ کا خوف دماغ میں اس طرح چمٹ گیا ہے کہ وہ ذہنی مریض بن گئے ہیں۔ ہمارا گھر مذہبی قدروں کا پابند ہے۔ گھر کے سب افراد نماز پڑھتے ہیں۔ معاشی حالات بھی اچھے ہیں، اس کے باوجود بھائی کے اوپر ایکسیڈنٹ کا خوف طاری رہتا ہے اور اس خوف نے ان کی زندگی بے کار کر دی ہے۔ وہ اب اپنی ملازمت پر بھی نہیں جاتے۔ عامل حضرات کا کہنا ہے کہ ان کے اوپر جادو کرایا گیا ہے۔ ہم اس بات کو ماننے کے لئے اس لئے تیار نہیں ہیں کہ ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ جب ہم کسی کا برا نہیں چاہتے تو کوئی ہمارا کیوں برا چاہے گا۔ برائے کرم بتایئے کہ اس خوف کی کیا وجہ ہے اور کیا ہمارے بھائی پر کسی نے جادو کرا دیا ہے؟

شکریہ، بنتِ حوّا

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

کچھ لوگوں کے ذہن میں چھپکلی یا بلّی کا خوف بیٹھ جاتا ہے اور یہ خوف ان کے دماغ سے اس طرح چمٹ جاتا ہے کہ وہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں حالاں کہ اس خوف کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی بس

ایک مفروضے کے تحت خیال خوف بن کر دماغ پر چھا جاتا ہے۔

میرے پاس ایک مریضہ لائی گئی جس کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ اس کے اوپر جادو کیا گیا ہے اور اس جادو کی وجہ سے کھانے کے بعد اس کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ شوہر اس بات کو بے بنیاد قرار دیتے تھے۔ میری تشخیص بھی یہی تھی کہ محض وہم ہے۔ علاج کے سلسلے میں ہضم سے متعلق کچھ دوائیں دے دی گئیں لیکن مرض میں افاقہ کی بجائے اضافہ ہوگیا اور درد کی شدت اتنی بڑھی کہ مریضہ کو دورے پڑنے لگے۔ اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ علاج پر کئی ہزار روپے خرچ ہونے کے باوجود مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے مصداق، مرض دگرگوں ہوگیا۔ اس کے بعد نفسیاتی اسپتال میں ایک ماہ تک علاج ہوتا رہا۔ پھر عامل حضرات سے رجوع کیا گیا۔

جب کسی بھی صورت فائدہ نہ ہوا تو مریضہ کو میرے پاس دوبارہ لایا گیا۔ میں نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ان کے تمام حالات سنے اور ان سے کہا، میں دیکھ کر بتاؤں گا آپ کے اوپر کس قسم کا اثر ہے، اور ان کو ہدایت کر دی کہ آپ دو تین روز کے بعد معلوم کر لیں۔ پندرہ روز تک وہ اپنے بارے میں مجھ سے پوچھتی رہیں اور میں ان سے فرصت نہ ملنے کی معذرت کرتا رہا۔ جب ان کا یقین اس نقطہ پر مرکوز ہوگیا کہ میرے سوا ان کا علاج کوئی نہیں کرسکتا تو میں نے ان سے کہا، آپ کے اوپر زبردست اثر ہے اور اس کا علاج یہ ہے، آپ صبح اذان سے پہلے اتنے بج کر اتنے منٹ پر بند آنکھوں سے میرا تصور کر کے بیٹھ جائیں۔ میں اپنی روحانی قوت سے یہ اثر ختم کر دوں گا۔

اب آپ مریضہ کی زبان سے ان کا حال سنئے۔ مریضہ نے مجھے بتایا،

"اس خیال سے کہ صبح وقتِ مقررہ پر میری آنکھ نہ لگ جائے، میں ساری رات جاگتی رہی۔ گھڑی دیکھ کر وقتِ مقررہ پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کے اندر سے میرے دماغ میں لہریں منتقل ہو رہی ہیں۔ جیسے ہی یہ لہریں میرے دماغ سے ٹکرائیں، میں نے دیکھا کہ میں ایک پرانے قبرستان میں ہوں۔ وہاں دو پرانی قبروں کے درمیان ایک جگہ میں نے مٹی کھودی اور اس میں سے ایک گڑیا برآمد ہوئی۔ اس گڑیا کے سینے میں دل کی جگہ میرا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے

وہ گڑیا قبرستان کے کنوئیں میں ڈال دی اور اسی وقت پیٹ کا درد ختم ہو گیا۔"

وقتِ مقررہ پر میں نے صرف یہ عمل کیا کہ اپنے خیال کی قوت سے مریضہ کو بتایا کہ آپ کے اوپر جو اثر تھا، وہ ختم ہو گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اوپر کوئی اثر یا جادو نہیں تھا۔

قانونِ تخلیق کے تحت انسان تین پرت کا مجموعہ ہے۔ ایک پرت صفاتی ہے، دوسرا پرت ذاتی ہے اور تیسرا پرت ذات اور صفات کو الگ الگ کرتا ہے۔ اس ہی پرت کو ہم جسدِ خاکی کہتے ہیں۔ ہر پرت کے محسوسات جداگانہ ہیں۔ ذات کا پرت وہم اور خیال کو تصور بنا کر جسدِ خاکی کو منتقل کر دیتا ہے اور تصورات کو معنی کا لباس پہنا کر خوشی یا غم کا مفہوم دیتا ہے۔ اگر اس کو ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو کسی خوب صورت باغ سے متعلق ہوں تو اس کے اندر رنگین لہریں، رنگین روشنیاں، خوشبو کے طوفان، حسن کے رجحانات رونما ہونے لگتے ہیں اور اگر ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو کسی حادثے سے تعلق رکھتی ہوں تو اس میں رنگین روشنیوں کی بجائے تاریکی، خوشبو کی جگہ بدبو اور حسن کی جگہ بدصورتی، خوشی کی جگہ غم، امید کی بجائے مایوسی اور محبت کی جگہ نفرت جیسے رجحانات رونما ہونے لگتے ہیں۔ اصل بات خیالات کو معنی پہنانے کی ہے۔ خیالات کو جو معنی دیے جاتے ہیں، وہ تصور بن جاتا ہے اور پھر یہی تصور مظاہراتی خط و خال اختیار کر کے ہماری زندگی کی راہ متعین کرتا ہے۔ غم و اندوہ سے لبریز یا آرام و آسائش سے بھرپور تصورات میں پیچیدگی، اخلاقی امراض کی بنیاد ہے۔

ہم جب زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ زندگی کے روز و شب اور ماہ و سال آدھے سے زیادہ آزردگی اور مایوسی میں گزر جاتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون سا راستہ ہے جس راستے میں مسرت کی روشن قندیلیں اپنی روشنی بکھیر رہی ہیں۔ وہ کون سی فضا ہے جس میں شبنم موتی بن جاتی ہے۔ وہ کون سا ماحول ہے جو معطر اور پُرسکون ہے۔ وہ کون سی خوش بو ہے جس سے شعور روشن ہو جاتا ہے۔

دعا گو، عظیمی

نامے میرے نام

"ماہنامہ قلندر شعور" نے قارئین خواتین و حضرات کو رسالے کے پلیٹ فارم سے تفکر کی دعوت دی ہے۔ رابطے کے قدیم و جدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔ ادارہ "ماہنامہ قلندر شعور" کا قارئین کے تفکر سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

اکتوبر 2025ء کے "آج کی بات" پر موصول تفکر نامے میں سے منتخب خطوط:

◈ نایاب علی (نیویارک): "آج کی بات" پڑھنے سے زیادہ الفاظ کے پردے میں نشر ہونے والی آواز کو سننے کا عمل ہے جو یادوں میں بسے احساسات سے جوڑ دیتی ہے۔ اکتوبر 2025ء کے اداریہ میں خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ محترم عظیمی صاحبؒ نے آواز اور تخلیقِ کائنات کی روحانی سائنس کو پرتوں کی طرح کھول کر بیان کیا ہے — یہ غور و فکر کے ایسے جہان میں لے جاتا ہے جہاں ہر مظہر ارتعاش کی شکل میں ظاہر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کائنات کے لاشمار عالمین میں ایک دنیا ارتعاش کی ہے۔

◈ شاہد محمود (کراچی): "کائنات آغاز سے اختتام تک آواز کے مدّ و جزر کا سفر ہے جو طولِ موج میں ظاہر ہوتا ہے"۔ یہ گہرا نکتہ ہے۔ آواز کو تخلیق کی بنیاد اور طولِ موج کو وجود کے اظہار کے طور پر بیان کرنا محترم عظیمی صاحبؒ جیسی ہستی کا وصف ہے۔ جس طرح توانائی مختلف فریکوئنسیوں میں ظاہر ہوکر مادی قالب اختیار کرتی ہے، اسی طرح شعور کی لہریں مختلف درجات میں آواز کے صعودی و نزولی مظاہر کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ مثلاً شعور اگر درجہ 'الف' میں ہے تو آواز کو سننے کا اس کا تجربہ 'ب' اور 'پ' کے شعور سے مختلف ہوگا۔ "آج کی بات" پڑھ کر یہ جملہ ذہن میں آیا کہ کائنات احساس کی الہامی سائنس ہے۔ احساس جس درجے میں ہوتا ہے، مظاہرہ بھی اسی درجے کا نظر آتا ہے۔

◈ حنا سلیم (رحیم یار خان): ہمارا سننا، دیکھنا، سوچنا، محسوس کرنا آواز کی لہروں کا ظاہری مظاہرہ ہے۔ آواز صرف سننے کی شے نہیں بلکہ اس کے اندر علمِ شے یا تخلیق کا جوہر ہے۔

◈ علی رضا (سیالکوٹ): حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ حق الیقین کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں آواز، انسیت، زندگی، حافظہ، مادی جسم کی ثانویت اور روح و جسم کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ جسم ثانوی ہے۔ جس قوت نے اسے حرکت میں رکھا ہے، وہ اصل ہے۔ اصل سے ربط ہو جائے تو لباس پر وارد موت و حیات کی حقیقت کا نظام سامنے آجاتا ہے۔

◈ رمشا (کراچی): اکتوبر 2025ء کا "آج کی بات" پڑھتے ہوئے قلب و ذہن موسیقی کے سُروں کی طرح ہم آہنگ ہو گئے۔ اندر میں آنکھ نے دیکھا کہ تحریر کا ہر جملہ ایک ارتعاش ہے جو ہمارے اندر کسی نہ کسی دنیا کے شعور کو بیدار کر کے تصور کی اسکرین پر تصویریں بنا رہا ہے۔ تصویر اور آواز الگ نہیں ہیں، یہ ایک عمل کے دو روپ ہیں۔ جو طولِ موج کی طوالت میں رہتا ہے، وہ الفاظ پڑھتا ہے اور جو طولِ موج کے اختصار میں مظاہر دیکھتا ہے، وہ "آواز" کی دنیا میں سفر کرتا ہے۔

◈ رابعہ زبیر (خانیوال): ازل کے بارے میں سوچا تو خیال آیا کہ زندگی آواز کا شعور ہے۔ کائنات کی تخلیق کا آغاز آواز سے ہوا، اور ہر چیز اس کی بازگشت میں زندہ ہے۔ ابد کے تصور سے ذہن میں تصویر بنی کہ ہر وجود عارضی ہے، ایک دن سب کچھ وہاں لوٹ جائے گا جہاں سے ظاہر ہوا ہے۔

◈ سعید انور (کوٹری): بہت سوچنے سمجھنے کی بات ہے کہ ہر شے آواز کی لہروں سے بنی ہے۔ جب طول کم ہوتا ہے تو شے نظر نہیں آتی جب کہ وہ موجود ہے اور جب لہروں میں طول بڑھتا ہے تو وہ نظر آجاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص کا ادراک اس کے شعور کی نسبت سے ہے۔

◈ ندا جاوید (اسلام آباد): زندگی ساز ہے جس میں سے لاشمار دُھنیں ظاہر ہوتی ہیں۔ جب یہ دُھنیں بصری شکل اختیار کرتی ہیں تو تصویریں بن جاتی ہیں۔ آدمی تصویروں کو دیکھتا ہے، جس دُھن پر تصویریں بنی ہیں، اس پر توجہ نہ دینے سے آواز — اس کے لئے بے آواز ہو جاتی ہے۔

◈ مریم (ابوظہبی): آخری جملے میں رفاقت کا قانون ہے۔ محترم عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں، "تصویر ہو یا تحریر — جس آواز سے تخلیق ہوئی ہے، وہ آواز کاغذ پر تحریر اور ذہن میں تصویر سے منسلک ہوتی ہے۔" تحریر پڑھتے ہوئے اسے اپنے اندر سننے سے ذہن کا ذہن سے ربط ہو جاتا ہے۔

◈ ثمینہ مقصود (قلندر شعور اکیڈمی، فیصل آباد): آدمی کی آنکھ محدود طولِ موج میں رہتی ہے لیکن روح اس دائرے کو بھی محسوس کرتی ہے جہاں خاموشی آواز بن جاتی ہے۔ زندگی کی ہر حرکت آواز سے وابستہ ہے یعنی خیال آواز ہے جو لطیف لہروں میں سفر کر کے مظاہرہ بنتا ہے۔ فرد کی کوشش پر منحصر ہے کہ وہ آواز کو اطلاع کے نزول کے کس درجے میں دیکھتا ہے۔ جیسے ساز خود نہیں بجتا، کوئی بجانے والا ہوتا ہے، ایسے ہی جسم خود نہیں چلتا، "آواز" اسے حرکت میں رکھتی ہے۔ مرشد کریم محترم عظیمی صاحبؒ فرماتے ہیں، "آواز میں وہ تخلیقی جوہر ہے جو مادے کو حیات بخشتا ہے"۔

◈ عائشہ رحمان (پشاور): "آج کی بات" مکتب ہے جو شعور کی تہوں میں اترنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ قاری اپنے اندر کے انسان سے مکالمہ کرتا ہے اور علم صفحات سے نکل کر تجربہ بن جاتا ہے۔ اس مکتب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ یہ پڑھنے والے کو سوچنے والا بنا دیتا ہے۔

اکتوبر 2025ء کے مضامین پر قارئین کی آرا اور تبصرے:

◈ صبا نسیم (لاہور): اکتوبر 2025ء کا شمارہ بہت خاص رہا۔ عقیدت کے موتی پروئی ہوئی تحریریں ہیں۔ مضمون نگاروں میں نئے نام اور ان کی تحریریں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ الحمدللہ، کارواں متعین سمت میں رواں ہے اور اباجی (مرشد کریم) کے بوئے ہوئے روحانی علم کے بیج پھل پھول رہے ہیں۔ "ماہنامہ قلندر شعور" سے ان کی طرز فکر کی خوش بو آتی ہے۔

◈ قرۃ العین (کراچی): روحانی استاد نے "آج کی بات" کے ذریعے ذہن کے ان دریچوں سے پردہ اٹھایا ہے جہاں دنیاوی علوم کی رسائی نہیں ہے۔ نیز ان کی محبت و سخاوت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے "نظریۂ رنگ و نور" کا خزانہ عوام الناس کے لئے صدقۂ جاریہ کر دیا۔ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحبؒ کی علمی و عملی خدمات کے بارے میں لکھنا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے جو ممکن نہیں۔ شاہد احمد صاحب نے "خیالِ یار" کو خوب صورت ترتیب و ترکیب کے ساتھ لکھا، لفظوں میں مقناطیسی کشش محسوس ہوئی۔ حنا الماس صاحبہ اور محترمہ کوکب شاہ عالم کی تحریریں پڑھ کر مرشد کریم سے مزید قربتوں کا احساس اجاگر ہوا۔

◈ مرسلین احمد (اسلام آباد): ”ماہنامہ قلندر شعور“ جہاں باطنی دنیا کے راستوں کی راہ نمائی کرتا ہے، وہاں اس کے موتیوں میں سے ایک نایاب موتی ”رملینہ — صحرا کی شہزادی“ ہے۔ رملینہ کا کردار راستے کے مشکل نشیب و فراز کی نشاندہی کرتا ہے لیکن ساتھ ہی باطنی راہ نمائی اس کو تھام کے رکھتی اور سرگوشی کرتی ہے کہ رکاوٹیں تجربات ہیں، رکنا نہیں، سفر جاری رکھنا ہے۔ مصنفہ نے ندی کی مثال سے سمجھایا کہ آخر ایک مقام پر ندی کو اپنا آپ ترک کرنا پڑتا ہے تاکہ اپنی وسعت سے واقف ہو اور خود کو اس مقام پر دیکھے جو مدتوں کی ریاضتوں کے بعد ملتا ہے۔ کہانی کے انداز میں سفر نامے کی روداد بہت اچھی ہے۔ امید ہے، قارئین کو بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔

◈ بی بی ہاجرہ (کراچی): اکتوبر 2025ء کے سرورق پر ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ کی رباعی پڑھ کر یادوں کے دِیے جل اٹھے۔ ابتدا سے آخر تک مضامین لاجواب ہیں۔ ”محبت و وفا کا پیکر“، ”بحرِ بے کراں“، ”خیالِ یار“، ”میں کون —؟“ اور ”مجھی کو دیکھ لیں اب تیرے دیکھنے والے“ بہت پسند آئے۔ اکتوبر میں نئے سلسلے ”رملینہ — صحرا کی شہزادی“ کی کہانی اور اندازِ تحریر متاثر کن ہیں۔ ”آفتاب و مہتاب“ میں تمثیل دلنشین پیرائے میں بیان ہوئی۔ بلاشبہ یہ رسالہ اباجی کی تعلیمات کی روشنی ہے۔

◈ وسیم تقی (عجمان): سلسلہ وار ناول ”رملینہ — صحرا کی شہزادی“ منفرد ہے۔ یونیورسٹی کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ فنا اور بقا کے سفر کی داستان ہے جس سے گزرنے والے شخص کے حال و قال پر روحانی تشخص محیط ہوجاتا ہے اور نئی پہچان دیتا ہے۔ اگلی اقساط کا انتظار ہے۔

◈ ارشد رشید (قاسم آباد): ”کورشِ اعظم“ بخوبی آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے مرکزی کردار میں انجانی کشش ہے جو یقیناً حق و معرفت کے راستے پر چلنے کی وجہ سے ہے۔ ”محبت و وفا کا پیکر“ اور ”خیالِ یار“ بہت اچھے لگے۔ محمد عاصم بیگ صاحب نے بھی اچھا لکھا ہے۔ محترم عظیمی صاحبؒ کی روحانی کلاس ”احسان و تصوف“ کے طالب علموں کی تحریروں میں گہرائی بہت ہے۔

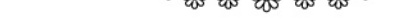

”ماہنامہ قلندر شعور“ کے ڈیجیٹل ایڈیشن کی سبسکرپشن کے لئے ویب سائٹ پر موجود فارم پُر کیجئے۔
ہمارا ویب ایڈریس یہ ہے، https://qalandarshaoormonthly.online/

ملک محمد ناصر

ہنوز لاہور دور است

کبھی آپ کو احساس ہوا ہے کہ کوئی جسم کی دیوار کے پیچھے سے دیکھ رہا ہے اور خاموش الفاظ میں کہتا ہے کہ دیکھنے کے لیے جسم کے پابند نہ رہو، میری طرح دیکھو؟

مے خانۂ حیات میں اس قدر شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ شور اندر ہو یا باہر، اس کے بڑھنے سے منظر کو دکھانے والی لطیف لہریں پردے میں چلی جاتی ہیں اور اپنی ذات میں ہر قسم کے شور سے پاک زندگی، شوریدہ[1] ذہن کے لیے معمّہ بن جاتی ہے۔

زندگی کا یہ کیسا سفر ہے کہ منزل کا پتہ ہے، راستہ معلوم ہے مگر ہم اس سمت نہیں جاتے؟ ہم ان راہوں پر چلتے ہیں جو منزل سے دور کرتی ہیں پھر ہم شکوہ کناں ہوتے ہیں کہ یہ کیسا سفر ہے جس کی منزل کی خبر نہیں۔

زندگی کا پہیّہ مسلسل گھوم رہا ہے۔ رفتار اتنی تیز ہے کہ سست ذہن مسافر کو پہیّے کی محوری گردش نظر نہیں آتی۔ سفر میں جب ذہن رکتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ گاڑی رکی ہے۔ گاڑی کب رکتی ہے؟ انجن مسلسل چل رہا ہے۔ یہ مسافر کا ذہن ہے جو رک گیا ہے۔ جب مسافر گاڑی کو ڈبّے اور سیٹوں سے پہچانتا ہے، وہ ہر بریک اور ہر اسٹیشن پر قیام کو گاڑی کا رکنا تصور کرتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ کچھ مسافر اتر رہے ہیں اور کچھ سوار ہو رہے ہیں مگر یہ نہیں سوچتا کہ گاڑی سے اتر کر مسافروں نے جس زمین پر قدم رکھا ہے، وہ زمین بھی گاڑی ہے جو وقت کی بیلٹ پر، اپنے مدار میں مسلسل رواں ہے۔

قارئین! یہ پُرسکون لمحات کی باتیں ہیں جو شوریدہ ذہن میں نہیں اترتیں۔

مسافر گاڑی رواں ہے۔ کچھ مسافر آنکھوں

۱۔ تلخ، پریشان، پراگندہ

میں نیند سجائے کسی اور دنیا میں جاگ رہے ہیں اور بعض سے نیند کوسوں دور ہے۔

ایک بچے نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا،

دادا ابو! لاہور کب آئے گا؟

بیٹا! میری گود میں سر رکھ کر سو جاؤ۔ جب لاہور آئے گا تو نظر آ جائے گا۔

دادا ابو، لاہور آ رہا ہے یا ہم جا رہے ہیں؟

وہ بچے کے بال سہلاتے ہوئے بولے، لاہور اپنی جگہ پر ہے اور ہم بھی — گاڑی چل رہی ہے، گاڑی۔ جب گاڑی منزل پر پہنچے گی تو خود بخود آنکھ کھل جائے گی۔

دادا ابو! آپ نے لاہور دیکھا ہے؟

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا، جی بیٹا، دیکھا ہے لیکن جب لاہور کی زمین پر قدم رکھتا ہوں، یہ نیا لگتا ہے اور مجھے اپنے دیکھنے پر شبہ ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں، میں نے کیا دیکھا ہے!

لاہور کو بارہ دروازوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ "در" کے لغوی معنی راستہ ہے، راستہ کھلنے سے مناظر کا مشاہدہ ہوتا ہے، نگاہ کی وسعت بڑھتی ہے۔ در اصل میں نقطہ ہے۔ اس کی آواز میں معمولی تبدیلی کر دی جائے، پیش لگا دیا جائے تو یہ دُر بن جاتا ہے۔ دَر کو دُر بنانے کا حل تفکر ہے، اسی سے راستے کھلتے اور نگاہ میں سمٹتے ہیں اور مسافر خالص موتی بن جاتا ہے۔

لاہور کی اپنی آن اور شان ہے۔ یہاں کے باسیوں کی بود و باش ان کی پہچان ہے۔ ان کی صبحیں گھی کے تڑکوں کی خوش بو سے مہکتی ہیں اور شامیں قہقہوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔۔۔ قدم قدم پر مہمان نوازی سے مہکتے دسترخوان سجتے ہیں اور میزبانوں کی زندہ دلی خوان کے ذائقے کو دگنا کر دیتی ہے۔

لاہور صرف شہر نہیں، اردو ادب کی تہذیب ہے۔ گزشتہ و رواں صدی میں ادب کے بڑے ناموں نے یہاں قیام کیا۔ شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، منیرؔ نیازی، اشفاق احمد، ابنِ انشاؔ، انتظار حسین اور بندۂ مزدور کی آواز — استاد دامنؔ جیسے منفرد ناموں سے اردو ادب کا دامن سجا ہے۔

لاہور ساز و آواز کا گہوارہ ہے جہاں سات سُروں کا دریا بہتا ہے۔ آج بھی یہاں پٹیالہ اور شام چوراسی گھرانے کے فرزند جب سُر اٹھاتے ہیں تو سننے والوں کی سانسیں راگ راگنیوں اور

سُروں کے زیر و بم سے اتھل پتھل ہوتی ہیں، اندر میں فضا ٹھہر جاتی ہے اور یادوں کے دیپ جل اٹھتے ہیں۔

اس شہر میں عبرت کی تصویریں ہیں تو حکمت کے گلزار بھی۔ ایک طرف سلطنتِ دہلی پر راج کرنے والی نور جہاں کا ویران مقبرہ ہے تو دوسری طرف اللہ کے دوستوں کے آباد دربار ہیں۔

لاہور صوفیوں اور ولیوں کا مسکن ہے۔ یہاں حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ، حضرت میاں میرؒ کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، حضرت مادھو لال حسینؒ کی یاد میں میلۂ چراغاں ہوتا ہے۔ عارفانہ کلام، قوالی کی محفلیں سجتی ہیں۔ جن کے سَروں میں سودا ہے، وہ ڈھول کی تھاپ پر وجد میں آتے ہیں — دائرہ انہیں کھینچ لیتا ہے۔

یہ داتاؒ کی نگری ہے — اس کی روحانی فضا حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے فیض سے روشن ہے۔ قریب اور دور دراز سے سائل آتے ہیں اور دامن بھر بھر جاتے ہیں۔ جب سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ سلام کے لیے حاضر و مراقب ہوئے تو فرمایا،

؎ گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را راہ نما

گاڑی ابھی لاہور نہیں پہنچی تھی لیکن ذہن اس کی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ تاریخ کے جھروکوں سے دیکھیں تو کتابِ زیست کے اوراق پھڑپھڑاتے نظر آتے ہیں۔ ایک صفحہ جاتا ہے، ایک آتا ہے۔ آنے جانے والوں کے ساتھ تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔

محبت کرنے والوں نے لاہور کو کئی نام دیے۔ کہنے والوں نے زبان زدِ عام کیا کہ

"جس نے لاہور نہیں دیکھا،
وہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

اس مقولے کو سمجھنے کا ایک انداز یہ ہے کہ جس شخص نے اس شہر میں رہ کر یہاں اللہ کے دوستوں کی خوش بو محسوس نہیں کی، اس کی فکری و روحانی بیداری کا آغاز نہیں ہوا — اس نے لاہور نہیں دیکھا۔

کسی نے شہرِ محبت کے بارے میں یہ بھی کہا،

؎ یہ جو لاہور سے محبت ہے
یہ کسی اور سے محبت ہے

جب کہ میں — لاہور کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے نقوش دیکھ کر یہ سوچ رہا ہوں کہ گاڑی ابھی لاہور نہیں پہنچی لیکن شہر آ گیا ہے،

نسیمِ صبح کی طرح تصور میں تازہ ہوگیا ہے اور میں اس کی لہروں میں سانس لے رہا ہوں، خود کو وہاں دیکھ رہا ہوں تو پھر لاہور ہے کہاں؟ یہ شہر ہے، کوئی یاد، کوئی خیال ہے، یہ ہے کیا اور کس سنگم پر واقع ہے—؟

جس شہر مجھے جانا ہے، وہاں قدم رکھنے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں تو سفر اور اس مقام کو کیا نام دوں اور اسے کہاں دیکھوں؟

باطنی علوم کے ماہرین فرماتے ہیں کہ انسان وحدت میں علم اور کثرت میں نگاہ ہے، نگاہ حس ہے۔ حواس جس نقطہ پر ٹھہرتے ہیں، ٹھہراؤ کا نام "شے" رکھ دیتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جس میں حواس شعور سے مانوس خط و خال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس اصول کے تحت وہ کسی کو کہیں پر اور خود کو کسی بھی جگہ دیکھ سکتے ہیں— لیکن دیکھنا فریب سے خالی ہو۔

اس تحریر میں سوال کا جواب اور جواب خود ایک سوال ہے— اندر کے در کو کھولنے کا۔

خواتین و حضرات! بشمول ہمارے کون کہاں اور کس جگہ پر ہے، یہ جاننے کے لیے کبھی آپ کو احساس ہوا ہے کہ کوئی جسم کی دیوار کے پیچھے سے دیکھ رہا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھنے کے لیے جسم کے پابند نہ رہو، میری طرح دیکھو؟

یہ وہی ہے جو کسی جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہمیں وہاں پہنچا دیتا ہے[۲] تاکہ ہم سمتوں کے فریب سے نکل کر ایک سمت ہو جائیں۔

- آدمی کہاں سے آتا ہے، کہاں چلا جاتا ہے؟
- مصور کس کینوس پر تصویریں بناتا ہے؟
- گائیک گاتا ہے۔ کیا سُر گلے سے نکلتے ہیں؟ وہ کون سا سفر ہے جس سے تمام سُر بنتے ہیں؟
- کہانی نویس کو اس کہانی کی تلاش ہے جس کو اپنی پہچان کہہ سکے۔ کیا کہانی پہچان ہے؟
- جب تک کسی جگہ اور شے کی تصویر دماغ کی اسکرین پر نہ بنے، وہ نظر نہیں آتی پھر ہم کہاں دیکھتے ہیں اور وہ جگہ اور شے کہاں ہے؟

یہ وہ سوال ہیں جو سمتوں میں الجھے ہوئے ذہن کو سمت شناس کر دیتے ہیں۔

حقیقت کا ذوق رکھنے والا اس قدر محتاط ہوتا ہے کہ وہ بہروپ پر تکیہ نہیں کرتا بلکہ اس کے روپ کو تلاش کرتا ہے۔

۲۔ جسم بعد میں پہنچتا ہے، نگاہ پہلے دیکھ لیتی ہے۔

ایک خط کے جواب میں ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے ذوق کے بارے میں فرمایا،

● ذوق وہ عادت ہے جو تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اس لیے نہیں کہ اسے کوئی معاوضہ ملے گا بلکہ صرف اس لیے کہ طبیعت کا تقاضا پورا کرے۔

● یہ نہ سمجھ لینا کہ ہر انسان کے اندر یہ ذوق موجود نہیں ہے۔ درحقیقت وہی ذوق لائف اسٹریم ہے، اس ہی زندگی کی بنا ہے۔ انسان اس کو استعمال کرے یا نہ کرے، یہ اس کی اپنی مرضی اور مصلحت ہے۔ یہ ذوق ہی انسان کے اندر بستا ہے ورنہ انسان خلا رہے۔

● ذوق میں نہ وزن ہوتا ہے نہ ذوق کے لیے فاصلہ کوئی معنی رکھتا ہے۔ نہ ذوق زمین آسمان کی حدود کا پابند ہے۔ نہ اسے وقت پابند بنا سکتا ہے۔ یہی ذوق چلتا پھرتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انسان اس سے اس وقت تک متعارف نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے تعارف حاصل نہ کرے۔ جب تعارف حاصل کرلیتا ہے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے، یہی ذوق انسان ہے۔ یہ پوری کائنات میں آزاد ہے۔ فرشتوں کا سربراہ ہے۔ اللہ کی بہترین صنعت ہے اور کائنات میں اللہ کا نائب ہے۔ وہ نہ پیروں سے چلنے اور ہاتھوں سے پکڑنے کا پابند ہے۔ نہ وہ آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کا محتاج ہے۔ یہ ساری خرافات انسان نے آپ ہی تخلیق کی ہیں اور آپ ہی ڈھول بجاتا پھرتا ہے کہ ہائے! میں تو بالکل مجبور ہوں۔

دادا ابو کی گود میں سر رکھ کر سونے والا بچہ کہیں پر جاگ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی، شاید کسی اسٹیشن پر پہنچی تھی۔ مسافر گاڑی میں ہلچل شروع ہوگئی تھی۔ ایک من چلے نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور خوشی سے کہا،

"لاہور آگیا ہے۔"

گاڑی پلیٹ فارم نمبر ۲ پر رک گئی تھی۔

دادا ابو نے پوتے کو جگایا کہ لاہور آگیا ہے۔

بچے نے کھل بند آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا، اتنی مرتبہ لاہور آکر جب آپ نے لاہور نہیں دیکھا تو دادا ابو، اب کیسے پتہ چلا کہ لاہور آگیا ہے — لاہور ابھی دور ہے!

(نوٹ) مضمون میں لاہور محض ایک شہر نہیں، بیداری کی تمثیل ہے۔ ابتدا سے آخر تک دوبارہ پڑھیے اور سر دھنیے۔ (ادارہ)

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور ــــ روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات و طلبہ کے لئے عظیمی صاحبؒ کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی

نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

حامد ابراہیم

سکون کا راز

اپنی ذات کا عارف بندہ الیکٹران کی برقی اور لہر کی خصوصیات میں تصرف کر کے کسی بھی نوعیت کی مادی اشیا کہیں بھی منتقل کر سکتا ہے۔

وضو کرتے یا نہاتے وقت جب پانی جسم پر پڑتا ہے تو لمس کے بے شمار تار دماغ کو برقی روؤں کی صورت میں پانی کے مَس ہونے اور بہنے کی اطلاع دیتے ہیں۔ زیادہ تر پانی بہ جاتا ہے تاہم جِلد اور پانی کے درمیان مخصوص قوت کی وجہ سے جِلد پر باریک تہ آجاتی ہے جو گیلے پن کا احساس دیتی ہے۔ احساس ہونے پر ہم جِلد کو تولیے سے خشک کرتے ہیں۔

کپڑے اور تولیے کی رگڑ کا احساس اینٹ اور پتھر کی رگڑ سے مختلف ہے۔ اسی طرح کھانے پینے میں لمس کے ساتھ دیگر حسّیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً غذا کا رنگ اور ساخت خوش نما لگے اور خوش بو پسند آئے تو رغبت سے کھاتے ہیں۔ کھاتے وقت منہ میں دانتوں اور زبان کی رگڑ اور میکانیکی حرکات کے ساتھ لعاب کے ذریعے جزوی کیمیائی تعاملات یا ری ایکشن ہوتے ہیں، غذا پس کر باریک ذرّات میں تبدیل ہوتی ہے تاکہ لعاب کے ساتھ غذا کے زیادہ سے زیادہ امتزاج سے ذائقے کا بھرپور احساس پیدا ہو۔

—◎—

لمس کے بے شمار رخ ہیں جیسے سردی گرمی، نرمی سختی، چیزیں پکڑنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، نہانا، کھانا پینا، سفر، لکھنا اور ہر نوعیت کے کام۔ ہر رخ تفصیل میں ایک دنیا ہے۔ لمس کے دوران خرد بینی اور اس سے نیچے سالمات کی سطح پر رگڑ، میکانیکی، برقی، مقناطیسی، کشش و گریز اور جذب کی قوتیں وغیرہ اثر انداز ہوتی ہیں اور مخصوص مقدار کے مطابق کردار ادا کرتی ہیں۔

لمس کی طرح فرد سننے اور دیکھنے کی ہزارہا جہتوں سے کام لے کر تقاضے پورے کرتا ہے

لیکن حواس و کیفیات کی اصل جانے بغیر ایک روز دنیا سے چلا جاتا ہے۔

روزمرہ کے معمولات ابتدا سے ایک ہیں پھر بھی ذہن شاذ ہی ان کو گہرائی میں دیکھتا ہے۔ یہ لکھتے ہوئے ذہن میں سوال ابھرتا ہے جو ظاہر میں سادہ لیکن باطن میں گہرا ہے۔

س: مظاہر کو تحریک دینے والی قوتیں کون سی ہیں، ہم ان کو کس حد تک محسوس کرتے ہیں؟

تحقیق و تلاش (سائنس) کے مطابق کائناتی مشینری میں چار بنیادی قوتیں کام کرتی ہیں۔

① کششِ ثقل کی قوت
② برقی مقناطیسی قوت
③ کمزور نیوکلیائی قوت
④ طاقتور نیوکلیائی قوت

برقی مقناطیسی اور کمزور نیوکلیائی قوت کے ایک ہونے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق مخصوص حالات میں دونوں قوتیں ایک ہیں لیکن عام حالات میں یہ چار سمجھی جاتی ہیں۔

کششِ ثقل کا احساس کسی آلے کے بغیر بخوبی ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہم اپنا اور دیگر اشیا کا وزن محسوس اور معلوم کر سکتے ہیں اور یہ اصول روزمرہ کے کاموں اور ہلکی بھاری مشینوں میں استعمال کرتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ برقی اور مقناطیسی قوتیں بھی ایک ہیں۔ جب برقی قوت حرکت میں آتی ہے تو مقناطیسی قوت پیدا ہوتی ہے، مقناطیسی قوت متحرک ہو کر برقی قوت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً بجلی کا جھٹکا محسوس کرنا یا ریشمی کپڑوں کی رگڑ سے پیدا ہونے والے برقی چارج ہمارے تجربات ہیں۔ دوسری طرف نیوکلیائی قوتیں کمزور ہوں یا طاقتور، طبیعیات کے ماہرین کے مطابق ہماری حسی حدود سے ماورا ہیں اس لیے ہم ان کو براہِ راست محسوس نہیں کرتے۔

س: لمس، رگڑ، درجۂ حرارت، دباؤ اور لاشمار مادی محسوسات جن سے ہم روزانہ گزرتے ہیں، کس قوت یا قوتوں میں شمار کیے جائیں گے؟

ج: ہر قسم کے مادی محسوسات کی بنیاد برقی یا برقی مقناطیسی قوت ہے جس کا منبع ایٹموں کے بیرونی حصے میں گردش پذیر الیکٹران ہیں۔

مثال: ہم ہاتھ میں قلم پکڑتے ہیں۔ قلم ہاتھ سے مَس ہوتا ہے لیکن جدا رہتا ہے۔

روشنیوں کے جسم میں اربوں کھربوں فارمولے کام کرتے ہیں جنہیں چار بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

مادے کے ایٹموں کا بیرونی حصہ الیکٹرانوں پر مشتمل ہے اس لیے مختلف مادے آپس میں مَس ہونے سے صرف ہاتھ اور قلم کے الیکٹران ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ دونوں طرف الیکٹرانوں پر منفی چارج کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر آپس میں مَس نہیں ہوتے بلکہ مخصوص فاصلے تک قریب آتے ہیں، کم یا زیادہ خلا ان کے درمیان موجود رہتا ہے۔ پھر مَس ہونے کا احساس کیوں پیدا ہوتا ہے—؟ وجہ الیکٹرانوں کے درمیان گریز کی قوت ہے۔

تجربہ: دونوں ہاتھوں میں دو مقناطیس پکڑیں اور ایک جیسے قطب آمنے سامنے کرکے انہیں ملانے کی کوشش کریں — ایک دوسرے کو دھکیلنے یا دور کرنے کی قوت کا مشاہدہ ہوگا۔

مادے کی بے شمار اقسام ہیں اور ہر قسم میں ایٹموں کی ترکیب مختلف ہے لہٰذا ان کے بیرونی مداروں میں موجود الیکٹرانوں کی تعداد اور ترتیب بھی الگ ہے۔ اس وجہ سے ہر مادّے کا لمس اور رویہ دوسرے سے منفرد ہے۔ بعض اوقات مختلف مادے آپس میں گھل مل جاتے ہیں جیسے شکر کا پانی میں حل ہونا۔ ایسی صورت میں بھی ایٹمی ذرّات کے درمیان فاصلہ یا خلا موجود رہتا ہے۔

کیمیائی تعاملات میں دو یا زیادہ اقسام کے ایٹم الیکٹرانوں سے باہم اشتراک کرتے یا کیمیائی بانڈ بناتے ہیں یعنی عارضی طور پر منتقل ہوتے ہیں لیکن الیکٹرانوں کی سطح سے ہرگز آگے نہیں بڑھتے البتہ نیوکلیائی تعاملات میں الیکٹرانوں کے غلاف کے اندر ایٹموں کے مراکز آپس میں ملتے ہیں یا پھٹ کر دو یا زیادہ مرکزوں (nuclei) میں تقسیم ہوتے ہیں۔ زمین کے ماحول میں ایسا انتہائی شاذ اور محدود پیمانے پر ہوتا ہے۔

معمّہ: سائنس کی رُو سے الیکٹران کو دیکھنا یا اس کا براہِ راست مشاہدہ کرنا ممکن نہیں۔ ابھی تک الیکٹران کے بارے میں جو نظریات قائم کیے گئے، وہ الیکٹران کے بالواسطہ تاثرات پر مبنی ہیں۔ یہاں "بالواسطہ" کے معنی وسیع ہیں۔

الیکٹران کے تاثرات جانچنے کے لیے بھاری آلات استعمال کیے جاتے ہیں اور خطیر وسائل خرچ ہوتے ہیں۔ ایک مثال دنیا کی سب سے بڑی اور مہنگی زیرِ زمین لیبارٹری CERN ہے جو بنیادی طور پر الیکٹران اور دیگر ذیلی ایٹمی ذرّات کے مطالعے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ

تقریباً 65 کلومیٹر طویل اور 27 کلومیٹر گول سرنگ جیسی ہے۔ اس پر تقریباً پونے پانچ ارب امریکی ڈالرز لاگت آئی ہے۔ غور طلب ہے کہ تہ در تہ آلات کا استعمال اور مادی حواس پر اکتفا براہِ راست مشاہدے کو ناممکن بنا دیتا ہے۔

—◎—

ہم بیداری کے دوران جن محسوسات میں سے گزرتے ہیں، سونے کے بعد نیند کی دنیا میں ان کا تجربہ کرتے ہیں۔ تجربہ خفیف اور کبھی اس قدر واضح ہوتا ہے کہ بیداری کے محسوسات کے برابر درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ بعض اوقات خواب کے محسوسات بیداری سے کہیں ارفع نوعیت کے ہوتے ہیں اور دور رَس اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان حالات میں غیر جانبدار ذہن سوچتا ہے کہ پھر محسوسات کی اصل کیا ہے؟ کیا یہ صرف الیکٹران اور اس کے مختلف تاثرات ہیں یا ہماری ذہنی کیفیات —؟ حتمی اور درست جواب روحانی سائنس کے پاس ہے۔

عظیم روحانی سائنس دان — حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ فرماتے ہیں،

"انسان روشنی سے بنا ہوا ہے اور اس کے سارے محسوسات الیکٹران کے اوپر قائم ہیں۔ اگر انسان اپنے اندر دَور کرنے والی الیکٹریسٹی سے واقفیت حاصل کر لے تو وہ مادی وسائل کے بغیر کسی بھی مادی شے کو جہاں چاہے، منتقل کر سکتا ہے۔" (کتاب: احسان و تصوف)

ایک اور جگہ پر تحریر فرمایا،

"تمام تجربات، مشاہدات اور محسوسات کا ماخذ ذہن ہے۔" (کتاب: مراقبہ)

دونوں نکات کو یکجا کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ صاحبِ مشاہدہ نے محسوسات کی حقیقت، ماخذ اور طرزِ عمل کی عقدہ کشائی فرمائی ہے۔ خواب اور بیداری میں محسوسات کا ادراک ذہن کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اطلاع ذہن کی اسکرین پر ترتیب سے بکھرتی ہے اور ہم اصل سے دور یا اصل سے قریب ذہن کے مطابق اسے سمجھتے ہیں۔ بیداری میں الیکٹران کا کردار نمایاں اور اہم ہے۔ محققین کے تجربات اور ان کے نتائج بتاتے ہیں کہ الیکٹران — ذرّے اور لہر یعنی مادہ اور روشنی، دونوں کی خصوصیات ظاہر کرتا ہے۔ فوٹان کے بارے میں بھی یہی دریافت کیا گیا ہے۔ لہر کی خصوصیت الیکٹران اور فوٹان میں مشترک ہے۔ انسان، جن، فرشتہ یا کسی نوع کے فرد کو ہم ذہن یا تفکر کے علاوہ کوئی نام نہیں

دے سکتے۔ محترم عظیمی صاحبؒ رقم طراز ہیں:

"انسان ہوں، جنات ہوں یا فرشتے، ان کے سراپا کا ہر فرد ایک پائندہ کیفیت ہے۔"

پائندہ سے مراد ہے کہ اصل موجود رہتی ہے اور مختلف زون میں عارضی قیام کے دوران لباس تبدیل کرتی ہے۔ اصل ذہن یا روشنی ہے۔ جب تک فرد روشنی (اصل) سے بنے انسان سے واقف نہیں ہوتا، لہر کا وقوف حاصل نہیں ہوتا— وہ ذرّات کی دنیا میں گم رہتا ہے۔

اپنی ذات کا عارف بندہ الیکٹران کی برقی اور لہر کی خصوصیات میں تصرف کر کے کسی بھی نوعیت کی مادی اشیا کہیں بھی منتقل کر سکتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں تخت کی منتقلی کا واقعہ اس کی روشن مثال ہے۔

لفظ "ذہن" گوشت پوست کا جسم اور دماغ نہیں بلکہ روشنی سے بنا وہ تشخص ہے جو جسم کے بکھرنے کے بعد دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ابدالِ حق نے اسے Concept اور روح کے الفاظ سے بھی بیان فرمایا ہے۔

—◎—

مادّی علوم میں قوت، توانائی اور طاقت کی الگ الگ تعریفیں متعین ہیں اور ان میں وقت کے ساتھ تبدیلی کی بنا پر معلوم نہیں کیا جا سکا کہ توانائی اور قوت کی اصل کیا ہے، ان کی ابتدا کیسے ہوئی اور ان کی بنیادی مقداریں کیا ہیں۔

روحانی علوم فلسفہ و قیاس میں الجھائے بغیر اجزائے کائنات کو اصل طرزوں میں سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ روح اپنے اور جسم کے درمیان میڈیم بناتی ہے جو معین فارمولوں کے تحت متحرک ہے۔ اس میڈیم کے بارے میں باطنی ذہن کی تحریر پڑھیے۔

"اس میں اربوں، کھربوں فارمولے کام کرتے ہیں جن کو ہم چار عنوانات میں تقسیم کرتے ہیں۔

Water Energy

Electric Energy

Heat Energy

Wind Energy

روحانیت کا طالب علم اس علم پر جتنی دسترس حاصل کر لیتا ہے، اتنا ہی اسے سکون مل جاتا ہے۔" (کتاب: نظریۂ رنگ و نور)

ان چار توانائیوں کو "روشنی" کی طرزوں میں سمجھنے کی جدوجہد کی جائے تو خوشی اور سکون کے راز کا انکشاف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سعیدہ شفیق میمن

میں کون ہوں ــــ؟

صبح سویرے
شبنم سے دھلے پھولوں پر نظر جمائے
چھوٹی سی معصوم لڑکی نے
سورج کی پہلی کرن کا نظارہ کرتے،
اپنے آپ سے سوال کیا کہ
میں کون ہوں ؟
کوئی جواب نہیں آیا
سوال ــــ خیال بن کر بازگشت بن گیا
لیکن یہ خیال جو اچھوتا اور منفرد تھا،
آوازوں میں بے آواز ہو گیا
لڑکی کتابوں کے اوراق میں گم ہو کر
اس سوال کو، منفرد خیال کو بھول گئی
پھر ایک دن سسّی کو پڑھتے ہوئے،
سوہنیؔ کے سر کو سینے سے لگاتے
اسی منفرد خیال نے دستک دی
لیکن ــــ اب لال رنگ کے جوڑے نے
اس سوال کو،
اس منفرد خیال کو
اپنے جمال سے ڈھانپ لیا
وہ چھوٹی لڑکی اب دوشیزہ تھی،
ایک نئے سفر پر نکلی،
جہاں خیال کی جگہ مسکراتے بچے نے لے لی،
کھل کھلاتی کلیاں، اس کی ہم جولیاں بنیں،
ماں کہہ کر آنچل کو تھام کے چلنا سیکھا،
شب و روز کا سلسلہ چلتا رہا،
وہ خیال جو بھول کے خانے میں چھپ گیا تھا،
کبھی کبھی دامن تھام لیتا تھا
مگر وہ اسے خاطر میں نہیں لاتی تھی،
اب وہ ماں تھی،
کہاں "میں" کے جال میں آتی ؟
عجب یہ ہوا کہ بچوں کے پَر نکل آئے،
وہ بچے جو پہلے چھوٹی اڑان بھرتے تھے
تو تازہ دم ہونے اسی کے پاس آتے تھے،
اب انہوں نے پرواز اونچی کر دی تھی
اور تسکین کے لیے
نئے بسیرے دریافت کر لیے تھے

فرصت کے لمحات جو میسر آئے تو
وہ خیال، وہ منفرد سوال پھر بیدار ہوا
سوچ کی آنچ نے اسے جوش دیا تو
فکر مراقب ہوئی اور توجہ کی کہ
میں کون ہوں؟
پلٹنے کی دیر تھی کہ ایک مہربان نے
شمس و آفتاب بن کر
آئینے کے روبرو کیا اور کہا،
سامنے کون ہے، تلاش کرو
فکر کے دریچے وا کرو
آئینے پر گرد تھی۔
مہربان کی روشنی آئینے پر پڑی
گرد صاف ہوئی — ادراک ہوا
میں وہ ہوں
جو عہد کی ڈور میں بندھی ہوئی ہے،
اثبات اور اقرار کر چکی ہے
عہد کی یاد جو تازہ ہوئی — دیکھا،
وہ معصوم لڑکی
جو ماں بن کر
بچوں سے دوری کے غم میں تھی،
خود اپنی زندگی کی ڈور سے دور ہے

مہربان نے روشنی دکھا کر،
بھول کے خانوں سے نکال کر،
اپنی دعاؤں کے حصار میں،
یاد کے رستے پر چلنا سکھایا
تاکہ تسکین — تکمیل بنے
اور بے قراری قرار بن کر بے قرار رہے
دل محبوب کی دید کے لیے مچلتا ہے
وہ آئینے کے روبرو آتی ہے
اس پر پڑی گرد ہٹاتی ہے
تو آئینہ کہتا ہے،
کئی مجاہدوں سے گزرنا ہے
کڑی ریاضتوں کا سفر طے کرنا ہے کہ
وہ خیال جو رہنمائے زیست ہے،
کہیں پھر گرد میں چھپ نہ جائے
لیکن — وہ مطمئن ہے کیوں کہ اب
شمس کی روشنی ہم سفر ہے اور
اس روشنی کے کنارے منزل سے ملتے ہیں
روشنی دکھا کر وہ بصارت سے دور ہو گیا ہے
لیکن بصیرت کی نگاہ ہر لمحہ دیکھتی ہے کہ
وہ دور ہو کر اور قریب آ گیا ہے،
مسکراتا، روشن اور — روشن۔

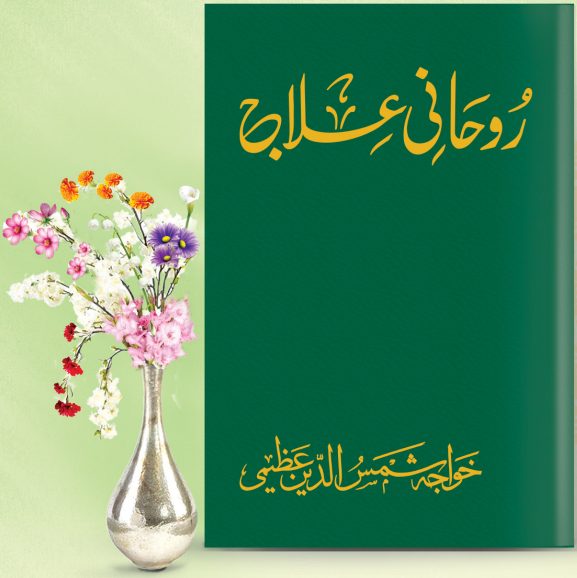

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بوسیلہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ہم سب پر نازل ہوں اور ہمیں جسمانی اور روحانی سکون حاصل ہو، آمین۔

شک اور بے یقینی کے طوفان سے پیدا ہونے والی تقریباً دوسو بیماریوں اور مسائل کو یکجا کر کے کتاب ”روحانی علاج“ میں ان کا حل شائع کیا گیا ہے۔ کتاب ”روحانی علاج“ کی مقبولیت کے پیشِ نظر قارئین کے تعاون سے ادارہ ”ماہنامہ قلندر شعور“ نے اس کتاب کو گھر گھر پہنچانے کا پروگرام بنایا ہے۔

جو خواتین وحضرات راہِ للہ کے اس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ادارے سے رابطہ کریں۔

ملنے کا پتہ : **عظیمی یونیورسٹی پریس®** سرجانی ٹاؤن، کراچی

+92 307111 5224

info@azeemiuniversitypress.com

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

عظیمیہ روحانی لائبریری جنڈ، اٹک

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات کے لئے عظیمی صاحبؒ کی تحریر کردہ اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

اوقات: عصر تا مغرب روزانہ | حاجی بازار، جنڈ، اٹک۔ موبائل نمبر: 03009145175

جسم اور روح

مقداروں کے ردّوبدل سے انسان کے اندر اور پوری کائنات کے اندر حرکت ہوتی ہے۔ اس حرکت کا نام مذہب روح رکھتا ہے اور سائنس دان اس کو لائف اسٹریم کہتے ہیں۔

ایک دفعہ لندن (کے دورے کے موقع پر) میں کوئی چھ سات سائنٹسٹ گھر میں آگئے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے، وہ اللہ کو نہیں مانتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے۔ خیر، یہ تو بے کار کی باتیں ہیں کہ اللہ کو نہیں مانتے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے ایک قصہ سنایا کہ ایک ڈپٹی کمشنر تھا۔ حضور بابا صاحبؒ اس کے ٹیوٹر تھے۔ اس کو اردو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ بیمار ہوگیا بہت شدید اور بیماری میں بے ہوش ہوگیا۔ اس قسم کا درد اور تکلیف تھی کہ وہ یوں ہاتھ مار رہا تھا اور کہتا تھا Oh God, Oh God, Oh God...۔

جب وہ اچھا ہوگیا تو حضور قلندر بابا اولیاؒ نے اس سے کہا کہ آپ تو اللہ کو نہیں مانتے لیکن جب آپ بے ہوش تھے تو تکلیف میں God کہہ رہے تھے۔

اس نے کہا، کوئی اور ہوگا، میں نے نہیں کہا۔

آپ اس کا نام لائف اسٹریم رکھ لیں، اس کا نام روح رکھ لیں، اس کا نام کچھ بھی رکھ لیں، بہر حال وہ وجود ہے جس سے آدمی انکار نہیں کرسکتا۔ اس کو ہم روح کے نام سے جانتے ہیں۔

اصل صورت یہ ہے کہ ایسی کوئی طاقت ہے جو مادی جسم کو بناتی ہے۔ ماں کے پیٹ میں کروموسوم ہے۔ اگر وہ طاقت نہ ہو تو ماں کے پیٹ میں بچہ نہیں ہوسکتا۔ مذہب نے اس کو روح کہا ہے۔ کوئی لائف اسٹریم نام رکھ دیتا ہے۔ کوئی کچھ نام رکھ دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ جو مادی وجود ہے ہمارا، یہ مادی وجود تابع ہے۔ کس کے؟ روح کے۔ اگر ماں کے پیٹ میں روح نہ آئے تو پیدائش نہیں

ہو سکتی۔ اگر روح کے آنے جانے کا نظام باپ کے اندر صحیح نہ ہو تو حمل نہیں قرار پا سکتا۔

اس جسم کی پوزیشن حضور قلندر بابا اولیاؒ کے فرمان کے مطابق، ایک لباس کی ہے۔ یہ پہلے بھی آپ نے پڑھا ہو گا، سنا ہو گا۔ اسے پھر سمجھ لیں۔ ایک گڈّا ہے۔ پانچ فٹ کا ہے۔ اس کے ہاتھ بھی ہیں، پیر بھی ہیں، منہ بھی ہے، سب کچھ ہے۔ اس کے اندر چابی بھر دیتے ہیں۔ اب چابی کو کھول دیتے ہیں۔ کیا ہو گا—؟ چلنا شروع کر دے گا۔ اس کے اندر آپ لاؤڈ اسپیکر بھی لگا دیتے ہیں، چھوٹی سی کوئی چِپ۔ اس کی وجہ سے وہ بولتا بھی ہے، وہ روتا بھی ہے، وہ ہنستا بھی ہے۔ گڑیوں میں دیکھا ہو گا آپ نے۔ ہمارا جو مادی وجود ہے، اس کی حیثیت اس کھلونے کے علاوہ نہیں جس کھلونے کی میں نے مثال دی۔ جب تک کھلونے کے اندر چابی بھری رہتی ہے، کھلونا چلتا رہتا ہے۔ جب چابی ختم ہو جاتی ہے، کھلونا رک جاتا ہے، مر جاتا ہے۔ اب آدمی میں اور کھلونے میں کیا فرق ہوا؟ کیا فرق ہوا؟ آپ بتائیں۔ ایک کھلونے میں اور ایک آدمی میں کیا فرق ہوا؟ انسان کا ذکر نہیں ہو رہا۔ آدمی کا اور کھلونے کا ذکر ہو رہا ہے۔ کیا فرق ہے؟ آدمی کے اندر بھی چابی بھری ہوئی ہے۔ اس کو مذہب روح کا نام دیتا ہے لیکن اگر روح نہ ہو، اس کھلونے کے اندر جسے ہم آدمی کہہ رہے ہیں، اسے حرکت کہہ لیں۔ کھلونے کے اندر چابی نہ ہو تو اس کے اندر حرکت نہیں رہتی۔ روح جو ہے، وہ ایک نظام ہے حرکت میں رکھنے کا۔ جب تک روح آدمی کے اندر ہوتی ہے، جسم متحرک رہتا ہے اور جب روح جسم کے اندر سے نکل جاتی ہے تو آدمی کیا ہوتا ہے—؟ حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح کھلونے میں چابی ختم ہو جائے، کھلونا رک جاتا ہے۔ چابی اور روح ایک چیز نہیں ہے لیکن مثال سے بات سمجھ میں آتی ہے۔

اب یہ صورت سامنے آئی کہ ہمارا مادی جسم ایک گڈّے کے علاوہ، ایک کھلونے کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جب تک کہ روح کی چابی اس کے اندر نہ ہو۔ اور اگر حیثیت ہے تو جب وہ چابی ختم ہو جاتی ہے یعنی روح نکل جاتی ہے تو ایک کھلونے کی جس میں چابی نہیں بھری ہوئی، اور آدمی کی، کیا دونوں کی حیثیت برابر نہیں ہوئی—؟

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم زندہ اس لئے ہیں کہ روح، یہ مثال ہے کہ روح ہمارے اندر چابی بھر رہی ہے۔ جب تک روح ہمارے اندر چابی بھرتی رہتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ روح حرکت ہے۔ جب تک حرکت ہمارے اندر منتقل ہوتی رہتی ہے، ہم چلتے رہتے ہیں اور جب روح یعنی چابی ہمارے اندر ختم ہو جاتی ہے، ہم مر جاتے ہیں۔ اصل کیا ہوا پھر؟ اصل کیا چیز ہوئی؟

اور یہ مادی جسم، اس کو حضور قلندر بابا اولیاؒ نے لباس کہا ہے، یہ میں نے پچھلی دفعہ بھی سمجھانے کے لئے آپ کو کہا تھا کہ ایک جسم ہے، اس کے اندر چابی بھری ہوئی ہے۔ کھلونے کا پورا ایک جسم بنا ہوا ہے۔ اس کے اندر چابی نہیں ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ مردے کی ہوئی نا؟ اور اسی کھلونے کے اندر چابی بھری ہوئی ہے، اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ اسے آپ زندہ کہیں گے، متحرک کہیں گے۔

خالقِ کائنات اللہ نے انسان کو ان صلاحیتوں پر تخلیق کیا ہے کہ

① آدمی کس طرح بنا؟

② اس کے اندر حرکت کس طرح ہے؟

③ آدمی مر کیوں جاتا ہے؟

④ آدمی کا جسم مٹی میں کیوں تبدیل ہو جاتا ہے، پانی بن کے؟

⑤ آدمی کیوں چلتا ہے، کیوں نہیں چلتا؟

اس قانون کو روحانیت کہتے ہیں۔

وہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ آدمی کیوں چلتا ہے۔ روح اسے چلاتی ہے۔

اچھا اب روح بھی کسی کے کنٹرول میں ہے۔ کسی نے روح کو بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپؐ یہ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور روح کے بارے میں جو علم دیا گیا، وہ بہت قلیل اور کم ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ روح کا علم دیا گیا ہے۔

آدمی روح کا علم سیکھ سکتا ہے۔

ایک آدمی ہے، وہ سائنس نہیں جانتا۔ ایک آدمی روحانیت نہیں جانتا۔ دونوں کی پوزیشن ایک ہی ہے۔ جب وہ سائنس پڑھنا چاہتا ہے تو سائنس کو جان جاتا ہے اور جب وہ روحانیت کو پڑھنا چاہتا ہے، روحانیت کو سمجھنا چاہتا ہے، روحانیت کو سیکھنا چاہتا ہے، وہ روحانیت کو سیکھ

لیتا ہے۔ یہ جتنے سلاسل ہیں، دو سو سلاسل حضور قلندر بابا اولیاؒ نے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ ایک اسکول ہے اور ان اسکولوں میں آدمی کو یہ بتایا جاتا ہے، یہ پڑھایا جاتا ہے کہ جسم کیا ہے؟ مادہ کیا چیز ہے؟ روح کیا چیز ہے؟ روشنی کیا چیز ہے؟ گیسز کیا چیز ہیں؟ یعنی جن چیزوں کا عمل دخل ہے انسانی تخلیق میں، ان سب کے اوپر روحانی علوم روشنی ڈالتے ہیں اور روحانی علوم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

یہ بات سمجھ میں آگئی کہ انسان وہ ہے جس کو ہم روح کہتے ہیں اور آدمی وہ ہے جو گوشت پوست کے پُتلے کو ہم آدمی کہتے ہیں۔ دو ایجنسیاں ہوگئیں، ایک گوشت پوست کا پُتلا اور ایک اس گوشت پوست کے پُتلے کو چلانے والا، محفوظ رکھنے والا، حفاظت کرنے والا، زندہ رکھنے والا یا زندگی سے فارغ کر دینے والا، وہ روح ہے۔

انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک مادی جسم اور ایک روح۔ مادی جسم عارضی زندگی ہے اور روحانی جسم مستقل زندگی۔ مستقل زندگی عارضی زندگی کو چلا رہی ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، وہ اس مادی جسم کو چلاتی رہتی ہے یا حرکت میں رکھتی ہے اور جب الٰہی نظام اور قانون کے تحت اس آدمی کو دنیا میں نہیں رہنا تو روحانی جسم یا روح کہہ لیجئے، وہ اس مادی جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے اور نتیجے میں آدمی مرجاتا ہے۔ مرنے کے بعد کوئی چیز فوری طور پر تبدیل نہیں ہوتی۔ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان، زبان، جگر، پھیپھڑے، ہڈیاں، کسی چیز میں 24 گھنٹے میں بالکل تبدیلی نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب آدمی مرگیا، ڈیڈ باڈی ہوگیا، کیوں ڈیڈ باڈی ہوگیا؟ کیوں ہوگیا؟ اصل مادی جسم ہوا یا روح ہوئی؟

پریشانی کی بات یہ ہے کہ آدمی کروڑوں اربوں سال سے اس مادی جسم کو سب کچھ سمجھ رہا ہے اور بڑی حیران کن بات ہے کہ روز آدمی مرتے ہیں، قبرستان بھر گئے ہیں۔ کبھی وہ یہ نہیں سوچتا کہ مجھے بھی اس قبر میں آکے سونا ہے۔ یہ جسم کیوں مرجاتا ہے—؟ کیوں قبر میں چلا جاتا ہے—؟ کیا چیز ہوجاتی ہے—؟ روز آدمی مرتے ہیں۔ وہ اس لیے مرجاتے ہیں کہ روح جس نے یہ جسم بنایا ہے، وہ اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے۔

اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ مادی جسم روح

کے تابع ہے۔ اس کا کوئی اصل وجود نہیں ہے۔ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ کے فرمان کے مطابق، روح نے مادی جسم لباس کی طرح پہنا ہوا ہے اور اس کی مثال پچھلی دفعہ میں نے دی تھی کہ ہاتھ ہلاؤ تو آستین ہلے گی۔ ہاتھ کو اگر ہم روح سمجھ لیں اور اس کے اوپر جو کُرتا پہنا ہوا ہے، اسے مادی جسم سمجھ لیں تو مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو جاتا ہے کہ ہاتھ ہلے گا تو آستین بھی ہلے گی۔ ہاتھ نہیں ہلے گا تو آستین بھی نہیں ہلے گی۔ اسی صورت میں، روح ہلے گی تو ہاتھ بھی ہلے گا۔ روح چلے گی تو ہاتھ چلے گا۔ روح نہیں چلے گی تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ روح اس جسم سے نکل جائے گی تو اب اس کے اندر سے حرکت ختم ہوگئی۔ نہ وہ سونگھ سکتا ہے نہ وہ بول سکتا ہے نہ وہ کھا سکتا ہے نہ وہ پی سکتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اس کے احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ مردے کو جلا دیتے ہیں۔ ابھی تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی کہ مردہ بیٹھ گیا ہو کہ بھائیو! میں تمہارا بیٹا ہوں، باپ ہوں، دادا ہوں، نانا ہوں، تم مجھے کیوں جلا رہے ہو؟ کسی آدمی نے جو قبر میں دبایا جاتا ہے، اس نے احتجاج نہیں کیا کہ میں تمہارا ابا ہوں، تمہیں پالا ہے، پوسا ہے، تمہاری شادی کی، تمہیں گھر بنا کے دیا، تمہیں بچپن میں کندھے پر لیے پھرا ہوں۔ تم مجھے یہاں اکیلے کیوں دبا کر جا رہے ہو؟ تمہیں خیال نہیں آتا؟ تمہیں رحم نہیں آتا اپنے باپ پہ؟ کیوں نہیں بولتا وہ؟ اس لیے نہیں بولتا کہ یہ جسم بول ہی نہیں رہا۔ سب دھوکا ہے۔ جسم اگر بول رہا ہوتا تو قبر میں بھی بولتا۔

اصل بات یہ کہ مادی جسم کی حیثیت سوائے کُرتے کے، قمیص کے، شیروانی کے یا لباس کے کچھ نہیں ہے۔ کُرتا، قمیص جب تک جسم کے اوپر رہتی ہے، جسم کے ساتھ آستین بھی ہلتی ہے۔ جسم حرکت نہیں کرتا، آستین بھی حرکت نہیں کرتی۔

روحانی علوم یہیں سے شروع ہوتے ہیں کہ مادی جسم جو ہے، یہ فکشن ہے۔ مادی جسم جو ہے مفروضہ ہے۔ مادی جسم ایک کھلونا ہے جس میں چابی بھری ہوئی ہے۔ اب اس چابی کو آپ تشبیہ دیتے ہیں روح سے۔ جب تک آدمی جسمانی حرکات و سکنات کو نہیں سمجھے گا، اس وقت تک وہ روحانی علوم نہیں سیکھ سکتا۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارا مادی جسم، فکشن جسے کہتے ہیں، مفروضہ جسے کہتے ہیں،

یہ بالکل بے حرکت و بے حس ہے۔ اگر اس کے اندر روح نہ ہو۔ بالکل ایسی بات ہے کہ ایک کھلونا ہے، اس کے اندر چابی بھری ہوئی ہے۔ اگر اس کے اندر چابی نہیں بھری ہوئی تو وہ کھلونا نہیں چلے گا۔ اب ہم کیا کہیں گے؟ کھلونے کی حرکت کیوں ہے؟ کیوں ہے؟ آدمی کی حرکت کیوں ہے؟ چابی نہیں ہے۔ چابی کا نام روح رکھ لو، روح کا نام چابی رکھ لو۔ اب اس کا کنٹرول کہاں ہے؟ یہ بہت زیادہ غور طلب بات ہے۔ اس سارے میکانزم کا کنٹرول کہاں ہے؟ جس ہستی کے ہاتھ میں اس کا کنٹرول ہے، ہم اس کو اللہ کہتے ہیں۔ ہندو بھگوان کہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایل کہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایلیا کہتے ہیں۔ کچھ لوگ God کہتے ہیں۔ اس کے نام مختلف ہیں۔ نام سے کچھ نہیں ہوتا، نام جو بھی رکھیں۔

مثلاً پانی ہے۔ پانی کا ایک نام تھوڑی ہے، پانی کے دو سو نام ہیں۔ دنیا میں دو سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر زبان میں پانی کو مختلف بولا جائے گا لیکن جب پانی کو ماء کہیں گے، جل کہیں گے، واٹر کہیں گے، پانی کہیں گے تو جیسے ہی آپ کے کانوں میں لفظ جائیں گے، آپ اپنی زبان کے مطابق اس کو پانی سمجھیں گے۔ اب اس طرح اللہ تعالیٰ کو کوئی بھگوان کہتا ہے، کوئی God کہتا ہے، کوئی پرماتما کہتا ہے۔ نام کچھ بھی ہو۔

بات زبانوں کی نہیں ہے۔ عربی میں اللہ تعالیٰ کو اللہ کہتے ہیں۔ تورات میں اللہ کو تورات کی زبان میں یہواہ بولا جاتا ہے۔ اس طرح ہندو اپنی زبان میں بولتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو ہیں، وہ اللہ ہے، ایک ہستی ہے۔ اس کے بہت سارے نام اس لیے ہیں کہ انسانی معاشرہ جداگانہ ہے۔ انسانی روایات جداگانہ ہیں۔ انسانی تقاضے جداگانہ ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک ہستی ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے اور اس تخلیق میں جو اس کی پہلی تخلیق ہے، وہ روح ہے اور روح کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بے شمار تخلیقات زمین میں بھر دیں۔

زمین میں کتنی مخلوق ہیں—؟ بے شمار مخلوق ہیں۔ مخلوق کوئی بھی ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ خالق ایک ہی ہے— اللہ تعالیٰ اور خالق کو سمجھے بغیر کوئی آدمی روحانی علوم نہیں سیکھ سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا یقین اللہ کے اوپر ہو اور آدمی روح اور جسم میں فرق کر سکے۔

نفیسہ شاکر

پتّوں کا ایثار

قدم لینے کی ایک مقدار وہ ہے جو تصور میں طے ہوئی اور ایک مقدار 'ایک، دو، تین' کی تقسیم ہے جو دراصل چلنے پھرنے کے نظام میں خلل ہے۔

خلق سے متعلق احکاماتِ الٰہی، تخلیقی نظام کے نقشے، مخلوقات کی نوعی و انفرادی صورتیں، ہر دنیا میں ان کے ظاہر اور غائب ہونے کا مقرر وقت، سب لوحِ محفوظ پر نقش ہیں۔ ان نقوش کو دیکھنے اور سمجھنے کا وسیلہ باطنی نگاہ کی بیداری ہے اور نگاہ کو بیدار کرنے کا راستہ یقین ہے۔ یقین کائناتی علوم کی شہ رگ ہے۔ یہ وہ فریکوئنسی ہے جس پر قائم ذہن کے لیے تخلیقی علوم کے راستے کھل جاتے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے،

"علم میں راسخ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔" (اٰلِ عمرٰن: ۷)

مخلوقات یقین کی مقداروں پر قائم ہیں۔ ان مقداروں کے اندر رہتے ہوئے ان میں ردّوبدل سے طرح طرح کے نقوش ظاہر ہوتے ہیں۔

زید ان نقوش کے نام رکھ لیتا ہے اور ان ناموں کو یقین کی مقداروں پر فوقیت دیتا ہے۔ نتیجے میں شک کی فریکوئنسی غالب آتی ہے اور یقین پردے میں چلا جاتا ہے۔ یقین سے محروم ہونا سب سے بڑی محرومی ہے کیوں کہ یہ زید کو محرم سے مجرم بنادیتی ہے۔

جنت میں آدمی محرمِ راز تھا۔
لیکن حکم عدولی کر کے راز کی قدر نہیں کی۔
اب زمین پر وہ مجرم نہیں تو اور کیا ہے؟

جب وہ ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے بھیجے گئے انبیا کرام علیہم السلام اور آخری نبی حضرت محمدؐ کی تعلیمات پر سچے دل سے عمل کرتا ہے تو اللہ کی رضا سے راز کا محرم ہو جاتا ہے۔

◆•◆•◆

شک میں مبتلا آدمی زمین سمیت ہر شے کی

اسپیس میں قید ہے۔ مثلاً تصور میں وہ خود کو پلک جھپکتے میں خانۂ کعبہ میں حاضر دیکھتا ہے۔ دوسری طرف پاس رکھی شے اٹھانے کے لیے قدموں کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔

غور کیا جائے تو تصور کی وسعت زمین کی سرحدوں سے بہت آگے تک ہے اس لیے کہ تصور آسمانی دنیا کا بھی قائم ہو جاتا ہے چاہے زید نے وہ دنیا نہ دیکھی ہو۔ اس کے برعکس مٹی کے جسم کی حد دو قدموں کے درمیان چند انچ ہے۔ قدم لینے کی ایک مقدار وہ ہے جو تصور میں طے ہوئی اور ایک مقدار 'ایک، دو، تین' کی تقسیم ہے جو دراصل چلنے پھرنے کے نظام میں خلل ہے۔ یہ شک کی کارستانی ہے جس نے زمین کی اسپیس کو لاشمار قدموں میں تقسیم کر دیا ہے اور ان کی طوالت سے زید وقت کا تعین کرتا ہے۔

آدمی زمین پر ضمیر کا قیدی ہے۔ اس قید میں کوئی اپنے لیے جائیدادیں بناتا اور ملکیت کے خوف میں گھلتا ہے۔ کوئی بڑے مکانات پر حسرت کی نگاہ ڈال کر اپنی جائے رہائش کی ناقدری اور ناشکری کرتا ہے جب کہ رہنے کی دونوں طرزیں دیواروں کے اندر بند ہیں۔

◆•◆•◆

دنیا کی موجودہ آبادی کم و بیش ساڑھے سات ارب ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ ساڑھے سات ارب میں اکثریت "شک" کی گرفت میں ہے۔ انہوں نے شک کے بچھائے گئے جال اور جال کے تانے بانے پر نقوش کو حقیقت سمجھ لیا ہے۔ اپنی سمجھ پر خوش ہوتے ہیں پھر روتے ہیں لیکن اس کا ترک نہیں کرتے کیوں کہ ان کی طرزِ فکر شک کی فریکوئنسی سے ملی ہوئی ہے۔ شک کی لہریں انہیں قید میں رکھتی ہیں اس لیے جہاں گریز محسوس ہوتا ہے، یہ لوگ آہ و فریاد شروع کر دیتے ہیں اور خود کو مظلوم کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب زید کو پیسے کے ذریعے آزمایا جاتا ہے تو وہ شکوہ کرتا ہے کہ یہ مصیبت مجھ پر کیوں آئی مگر جب وہ صبر کرتا ہے تو ذہن میں پیسے کی چپک پر ضرب پڑتی ہے، یوں چپکی ہوئی تہ کے سالمات (مالیکیولز) یعنی ایٹموں کے درمیان بانڈز ٹوٹ جاتے ہیں اور زید خوف اور غم سے نکل کر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتا ہے۔ اللہ بے حساب رزق عطا فرمانے والا ہے۔

سالمات کی ٹوٹ پھوٹ کی مثال ایسی ہے کہ درخت سے پتّا گرتا ہے اور رفتہ رفتہ خشک ہوتا ہے، اس کے ریشے کھلتے ہیں۔ آخرکار وہ کھاد بنتا

ہے، کھاد سے نباتات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔

پتّے کو کھاد بننے کے لیے اپنی موجودہ حالت بدلنی پڑی ـــ بکھرنا پڑا لیکن وہ ختم نہیں ہوا، اس میں توانائی سے زمین پر درختوں کی دنیا آباد ہے اور وہ مخلوقات سانس لے رہی ہیں جن کی غذا نائٹروجن ہے۔ یہ پتّے کا ایثار ہے جس نے اس کی توانائی کو طول و عرض میں پھیلا دیا۔

آزمائش اس چیز کے ذریعے ہوتی ہے جس میں آدمی کا دل لگا ہوتا ہے۔ یہ ذہن پر کسی چیز کی جمی ہوئی تہ کو توڑتی ہے تاکہ اندر میں سے یقین سے معمور ذہن ظاہر ہو۔

زید کو زر پرستی کی فریکوئنسی سے آزاد کرنے کے لیے آزمائش آئی تھی تاکہ احساس ہو کہ پیسہ آنی جانی چیز ہے لیکن رزق دینے والی ذات اللہ، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

◆•◆•◆

آخری آسمانی کتاب قرآن کریم ضابطۂ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

"اس کتاب میں شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔" (البقرۃ: ۲۔۵)

قرآن کریم کو سمجھ کر نہ پڑھنے کی وجہ سے آدمی کے اندر یقین کی مقداریں بکھر گئی ہیں، اس وجہ سے آج پیسے کے لیے دوڑ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر خاتون یوٹیوب، انسٹاگرام، ایکس اور ٹک ٹاک سے متاثر ہو کر بزنس کرنا چاہتی ہے جب کہ مرد ذمہ داریوں سے بے فکر اور شارٹ کٹ کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ یہ تربیت کس نے کی اور ایسے ذہن آگے جا کر اپنے بچوں کی کیا تربیت کریں گے؟

ایک خاتون جن کا گھر اور گزر بسر اچھی ہے، ساتھ رہنے والے ذمہ دار ہیں، شوہر معاش کے فرائض پورے کرتے ہیں، ضرورت کی چیزیں موجود ہیں لیکن خاتون کے ذہن میں پیسہ کمانے کی دُھن ہے۔ وہ دستیاب وسائل کو نظر انداز کر کے ناخوش رہتی اور فساد کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے بچے متاثر اور گھر کی فضا مکدّر ہے۔ یہی خاتون انسٹاگرام پر فرضی نام سے اکاؤنٹ بنا کر

(تاکہ اکاؤنٹ گھر والوں کی پہنچ سے دور ہو)
پوسٹ لگاتی ہیں جس میں دیدہ زیب لباس پہن کر گفٹ پیپر میں بند تحفہ سامنے رکھتی ہیں، ماحول کو موم بتیوں سے سجاتی ہیں اور نیچے لکھتی ہیں،

"شکر گزار ہوں کہ یہ سال میرے لیے خوشیوں کی نوید لایا ہے۔"

جب یہ پوسٹ میری نظر سے گزری تو دیکھ کر افسوس ہوا کیوں کہ یہ خطرناک ذہنی کیفیت اور معاشرے کی حالیہ تصویر ہے۔ ایسی چیزیں دیکھ کر کچے ذہن کے لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں کہ یہ خاتون کتنا خوش رہتی ہیں، ہمارا لائف اسٹائل ایسا کیوں نہیں ہے—؟ اب لوگوں کو کون بتائے کہ یہ دھوکا ہے۔ خاتون معاشی طور پر درمیانے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے حالات اچھے ہیں لیکن ناشکری اور فساد کی وجہ سے لائف اسٹائل اچھا نہیں ہے۔

ایک ملاقات میں حسبِ معمول خاتون کے چہرے پر ناشکری کے جلے ہوئے رنگ تھے۔ میں نے سلام کیا اور کہا، آپ سے نہیں، ان سے ملنے آئی ہوں جو انسٹاگرام پر ہوتی ہیں۔ چہرہ شرمندگی سے سرخ ہوگیا۔

یقین کی فریکوئنسی پر قائم ہونے کے لیے ذہن کی مرکزیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ جن وسائل کے پیچھے ہم بھاگ رہے ہیں، وہ ضرورت کے مطابق ہمیں قدرت کی طرف سے ملتے رہتے ہیں۔ ضرورت سے زائد بینک یا زمینوں میں بند ہوتا ہے، ہمارے استعمال میں نہیں آتا لیکن ہم خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا ہے۔

قابلِ غور ہے کہ آدمی دنیا میں پیسے جمع کرنے اور جائیداد بنانے نہیں آیا۔ وسائل کا وعدہ رازق اور مالک اللہ نے کیا ہے جب کہ وسائل کے لیے محنت کا حکم دماغ کو وسوسوں سے محفوظ اور جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے ہے۔

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے ثمرات پیدا کیے۔"

(ابراہیم: ۳۲)

آدمی رب کو پہچاننے کے عظیم مقصد کے لیے یقین کی فریکوئنسی کے ساتھ بھیجا گیا ہے تاکہ یہ فریکوئنسی جہاں جہاں کام کر رہی ہے، وہ اشیا اور مقامات آدمی کے سامنے روشن ہو جائیں۔

خورشید احمد

روبوٹ نے انڈا پکڑنا سیکھا

انسانی وجود کی اَن گنت صلاحیتوں میں ایک وصف ایسا ہے جسے ہم صلاحیت نہیں سمجھتے جب تک کہ اس سے محروم نہ ہو جائیں۔ وہ صلاحیت کیا ہے—؟

چھوٹی بڑی ہر مخلوق کی جسمانی ساخت اور افعال حیرت انگیز ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جدت احسنِ تقویم پر فائز نوعِ آدم کو حاصل ہے۔ نوعِ آدم میں علم کے اعتبار سے آدمی اور انسان کی درجہ بندی ہے۔ آدم کو عطا کی گئی ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے واقف فرد کا نام انسان ہے اور ان صلاحیتوں سے لاعلم فرد آدمی ہے۔ آدمی کے باطن میں انسان کو حاصل علوم موجود ہیں، اگر وہ ان کا علم حاصل کرلے تو احسنِ تقویم کی روشنی حواس بن جائے گی۔

نوعِ آدم کے جسمانی وجود میں کسی بھی کام کو کرنے کے لئے لچک موجود ہے۔ اس کی تخلیق اس قدر حیرت انگیز ہے کہ سینکڑوں سال سے محققین اسے جاننے کی کوشش میں ہیں اور اب تک یہ نہیں کہہ سکے کہ ہم واقف ہوگئے۔ آئے روز انکشافات ہوتے ہیں اور آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ابھی کیا کچھ دیکھنا باقی ہے۔

جسم آدمی کا ہو یا انسان کا، دونوں کو یکساں صلاحیتیں حاصل ہیں۔ بات علم اور لاعلمی کی ہے۔ آدمی کچھ نہ جان کر بھی یہ ضرور جانتا ہے کہ جب تک زندگی ہے، جسمانی مشین بند ہوتی ہے نہ رکتی ہے۔ اندرونی و بیرونی حرکات تیز یا سست رفتاری سے جاری رہتی ہیں۔ چلنا، پھرنا، دیکھنا، سننا، پکڑنا، بولنا — ہر حرکت پر تحقیق سے حیرت کے باب کھل رہے ہیں۔ مثلاً آنکھ میں روشنی کے داخلے کے لئے 10 ملی میٹر سے چھوٹی پُتلی وسیع و عریض رقبے کا احاطہ کرلیتی ہے مگر اس منظر کو تصویروں میں محفوظ کرنے کے لئے بڑے بڑے کیمرے درکار ہوتے ہیں پھر بھی ایڈیٹنگ سافٹ ویئر کی مدد لینی پڑتی ہے

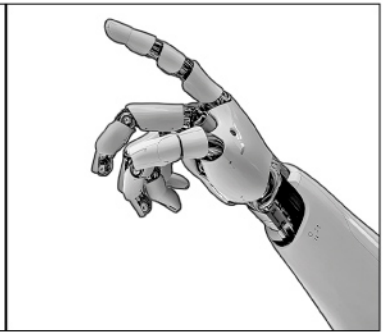

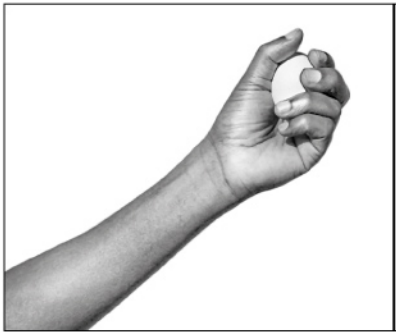

تاکہ تصویر آنکھ کے دیکھے ہوئے منظر جیسی لگے اور پورا منظر کیمرے کے ایک شٹر کی حد میں آجائے۔ یہی معاملہ اندر میں دوسری صلاحیتوں کی نقل کے لئے ایجاد کی گئی ٹیکنالوجی کا ہے۔

انسانی وجود کی اَن گنت صلاحیتوں میں ایک وصف ایسا ہے جسے ہم صلاحیت نہیں سمجھتے جب تک کہ اس سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہ ہے گرفت کی صلاحیت — جس میں کندھے، کہنی، کلائی، انگلیاں اور اعصاب سب مل کر یکجان ہوتے ہیں۔ یہ ہم آہنگی شے کو پکڑنے میں مدد دیتی ہے۔ خدانخواستہ کوئی شخص اس صلاحیت سے محروم ہو جائے تو ایک طرح سے وہ زندگی کے کئی معاملات میں مفلوج ہو جاتا ہے۔

کلائی کی حرکت ہاتھ کو موڑ کر انگلیوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ گرفت کے عمل میں شریک ہوسکیں۔ کسی شے کو قریب یا دور لے جانے اور اوپر نیچے کرنے میں کہنی اور کندھا اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ یوں گرفت کے لئے ایک مربوط سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو حرکت کو ایک سے دوسرے حصے میں دھکیلتا ہے، یہاں تک کہ انگلیاں شے کو تھامنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام عمل تالاب میں پھینکے گئے کنکر سے بننے والے دائروں کی طرح ہے جو ایک کے بعد ایک پھیلتا جاتا ہے۔

جسمانی نظام کو چلانے والے اعصاب حساب اور رفتار میں اتنے تیز ہیں کہ آدمی ہلکی بھاری شے سوچے سمجھے بغیر اٹھالیتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ جس قدر قوت اس عمل میں صَرف ہوتی ہے، اگر وہ انڈے پر لگائی جائے تو انڈا ٹوٹ جائے لیکن جب آدمی کسی شے کو اٹھاتا ہے، وہ نرم ہو یا سخت، سلامت رہتی ہے۔ کیوں —؟

انڈے پر اس مقدار میں قوت لگائی جائے جتنی ہتھوڑی پکڑنے میں صَرف ہوتی ہے تو انڈا ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح جس قوت سے انڈا اٹھایا جاتا ہے، وہ ہتھوڑی پر لگائی جائے تو اسے اٹھانے میں ناکامی ہوگی یا وہ ہاتھ سے پھسل کر گر جائے گی۔ اس سے کیا ظاہر ہوا—؟

جب فرد کسی شے کو پکڑتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر اس کے وزن، مضبوطی اور حجم کے مطابق قوت کو ہم آہنگ کرلیتا ہے، تب جاکر گرفت میں لیتا ہے۔ گرفت بھی ایک مکمل نظام ہے جس میں ہر شے کو پکڑنے کے لئے قوت کی مخصوص مقدار درکار ہوتی ہے۔ اگر یہ مقدار حد سے زیادہ ہو تو شے ٹوٹ سکتی ہے اور اگر کم ہو تو ہاتھ میں نہیں ٹھہرتی۔

ہاتھ سے کوئی شے پکڑنے میں کتنی قوت اور صلاحیتیں کام کرتی ہیں، اس کا اندازہ محققین کو اس وقت ہوا جب روبوٹ کے ہاتھ سے انڈا اٹھانے کا تجربہ کیا گیا۔ ابتدا میں بھائی روبوٹ نے کئی انڈے توڑ دیے۔ وجہ گرفت میں سختی تھی۔ متعدد تجربات کے بعد محققین نے اس کی گرفت میں نرمی پیدا کی اور وہ انڈا توڑے بغیر اٹھانے کے قابل ہو گیا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھاری چیزیں پکڑنے کی قوت باقی نہیں رہی۔

آدمی ہلکی اور بھاری دونوں چیزیں اٹھاسکتا ہے، بات مشق کی ہے۔ مشق کے ساتھ ساتھ انسان بننے کے لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ گرفت محض ایک حرکت نہیں بلکہ صلاحیتوں اور مقداروں کا توازن ہے جسے وہ لاشعوری طور پر یا سوچے سمجھے بغیر استعمال کر رہا ہے۔

کم خواتین و حضرات جانتے ہیں کہ روبوٹ سازی کا سہرا مسلمان سائنس دان الجزری کے سر ہے۔ وہ اس فن کا بانی ہے۔ جو نہیں جانتے، وہ روبوٹ کو مغرب کی ایجاد اور کمال سمجھتے ہیں۔

مغرب نے 1970ء کی دہائی میں کچھ خودکار مشینیں تیار کیں جو اپنے افعال میں محدود تھیں۔ 1990ء کی دہائی میں ان میں چھونے کے لئے حساس سینسر نصب کئے گئے جن کی بدولت وہ انڈے پکڑنے کے قابل ہوئیں۔ 2000ء میں ان کے ہاتھوں پر نرم دھاتیں چڑھائی گئیں جس سے انڈے پکڑنا مزید آسان ہو گیا۔ 2010ء کے بعد سے لے کر آج تک مصنوعی ذہانت اور

دوسری ٹیکنالوجی کے امتزاج نے ان مشینوں کو اس کام میں خاصا ماہر بنادیا تاہم اس عمل کو مزید آسان بنانے پر کام ہورہا ہے۔ ایسی مشینوں کی ضرورت پولٹری فارم وغیرہ میں زیادہ محسوس کی جاتی ہے جہاں انڈے، گلاس نقصان پہنچائے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھے جاسکیں۔

سوچئے — انڈے کو توڑے بغیر پکڑنا کس قدر حساس کام ہے کہ دنیا بھر کے ماہرین اس کے لئے مشینوں پر مشینیں بنارہے ہیں، اور ہم صبح شام یہ عمل اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے ہیں مگر ایک لمحے کو نہیں سوچتے کہ اشیا کو پکڑنے کی یہ گرفت کتنی بڑی نعمت ہے۔

گرفت صرف ہاتھوں کا عمل نہیں بلکہ ہاتھ، آنکھ اور دماغ کے درمیان تیز ترین رابطہ ہے جس میں دماغ آنکھ اور لمس کے ذریعے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کسی شے کو پکڑنے کے لئے کتنی مقدار میں قوت درکار ہے۔

جسم میں حسی اعصاب دماغ کو مسلسل اطلاع دیتے ہیں جیسے چھونے، دیکھنے یا توازن کی خبر۔ جب جسم کے کسی حصے کو حرکت دینا ہوتی ہے تو دماغ حرکی اعصاب کے ذریعے پٹھوں کو پیغام بھیجتا ہے۔ جیسے ہاتھ اوپر اٹھانا ہو تو دماغ سے کندھے کے پٹھوں تک اشارہ پہنچتا ہے، نتیجے میں پٹھے سکڑتے ہیں، ہڈیوں کو کھینچتے ہیں، یوں ہاتھ بلند ہو جاتا ہے۔

آج جو روبوٹ نازک، سخت اور بھاری اشیا پکڑ لیتے ہیں، ان کی تیاری میں دہائیوں کی محنت اور تحقیق صَرف ہوئی ہے۔ یہ آج کے دور کی بات ہے ورنہ دنیا صدیوں پہلے اس علم و فن میں جدت دیکھ چکی ہے۔

موجودہ روبوٹس کے ہاتھوں میں ایسے سینسر لگائے گئے ہیں جو آس پاس اشیا کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نصب کیمرے اشیا کی شکل و صورت اور حجم کا ڈیٹا دماغ میں لگی چِپ تک پہنچاتے ہیں۔ چِپ میں ریکارڈ معلومات کی مدد سے دماغ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ شے کیا ہے اور اسے پکڑنے کے لئے انگلیوں اور ہاتھ کو کس طرح حرکت دینی ہے۔ پھر ہاتھ میں لگے سینسر سختی اور حرارت سے آگاہ کرتے ہیں۔

روبوٹ کے اندر یہ ٹیکنالوجی اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو قدرت نے آدمی کے اندر پہلے دن سے موجود رکھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اس نظام پر غور کرے، یہ دیکھے کہ جسم کی ہر رگ

اپنی جگہ ایک مکمل نظام ہے جو باقی تمام رگوں سے مربوط ہے۔

روبوٹ میں ذخیرہ کی گئیں معلومات پہچان میں مدد دیتی ہیں۔ شے کو ہاتھ سے پکڑنے کے لئے کتنی قوت استعمال کرنی ہے اور کس زاویے سے اٹھانا ہے، یہ ہدایات پہلے سے منتقل کر دی گئی ہیں۔ اسے مشین لرننگ کہتے ہیں۔

روبوٹ کے پاس جتنی معلومات ہیں، وہ دنیا میں موجود علم، ادب اور ثقافت کا ریکارڈ ہے۔ اس میں کتب، تقاریر، لکھی اور بولی جانے والی تمام باتیں شامل ہیں۔ ان کی مدد سے وہ بہت سی چیزوں کے بارے میں اندازہ لگا لیتے ہیں۔

کوئی صاحب یا صاحبہ جب برتن دھوتے ہیں تو مختلف اقسام کے نل کھول کر گول پلیٹیں، بڑے چھوٹے اسٹیل یا شیشے کے گلاس، ہینڈل والے کپ، چمچے، کفگیر — سب بآسانی سنبھال لیتے ہیں، برتنوں کو فوم یا جالی سے رگڑتے اور صابن لگاتے ہیں پھر پانی سے کھنگال لیتے ہیں۔

محقق ایسے روبوٹ تیار کرنے کی کوشش میں ہیں جو آدمی کے قائم مقام بن جائیں۔ مصنوعی ذہانت میں روز بروز جدت دیکھ کر بظاہر لگتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب ایسا ہو جائے لیکن روبوٹ کے انڈا پکڑنے کی جدوجہد کو دیکھ کر چہرے پر "مسکراہٹ" آجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو آدمی خود کیا کرے گا۔

قارئین! جواب کا انتظار ہے۔

پانی سے چلنے والی گھڑی

بدیع الزمان اسماعیل بن الجزری بارہویں صدی عیسوی کے مسلمان موجد، میکینکل انجینئر اور مصور تھے۔ وہ روبوٹکس اور خودکار مشینوں کے بانی ہیں۔ جنوب مشرقی میسوپوٹیمیا (موجودہ ترکی) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب فی معرفۃ الحیل الھندسیہ" میں 50 سے زائد میکانیکی آلات کی تفصیل اور خاکے شامل کئے ہیں۔ الجزری نے خودکار دروازے، پانی سے چلنے والی گھڑیاں، موسیقی بجانے والے آلے اور دیگر آٹومیٹا ایجاد کیے۔ ان ایجادات میں کرینک شافٹ جیسے بنیادی پرزے استعمال کیے جو بعد میں جدید مشینری کی بنیاد بنے۔ ان کی خدمات انجینئرنگ، آٹومیشن اور روبوٹکس کی تاریخ میں نمایاں اور اپنے دور کے لحاظ سے منفرد ہیں۔

؟

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو لاشمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان میں کئی صلاحیتیں ایسی ہیں جن کو ہم عموماً صلاحیت شمار نہیں کرتے لیکن علمی لاعلمی میں ان سے مستقل کام لیتے ہیں۔ ایسی ایک صلاحیت ”گرفت“ ہے — کسی شے کو پکڑنا۔ گرفت کی قدرتی سائنس پر غور کرنے سے توانائی اور مقداروں کے قوانین کا انکشاف ہوتا ہے۔ آدمی اس صلاحیت کی قدر نہیں کرتا لیکن خدانخواستہ اس صلاحیت سے محروم ہو جائے تو پھر ہاتھ میں کچھ نہیں رہتا۔

کسی شے کو پکڑنے اور اٹھانے میں کئی قوتیں ایک معین مقدار کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔ مثلاً جو قوت میز پر رکھے ربر بینڈ کو اٹھانے میں صَرف ہوتی ہے، اس قوت سے ہم کاپی نہیں اٹھاسکتے۔ کاپی اٹھانے کے لئے اضافی قوت درکار ہے۔ اسی طرح خالی گلاس اٹھانے کے لئے جتنی مقدار میں قوت ضروری ہے، اس مقدار سے پانی سے بھرا ہوا جگ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔

اکثر ہم سمجھتے ہیں کنستر پانی، خوردنی تیل یا کسی اور مائع سے بھرا ہوا ہے۔ بھرے ہوئے کنستر کے وزن کو ذہن میں رکھ کر اسے اٹھاتے ہیں تو جھٹکا لگتا ہے کیوں کہ — کنستر خالی ہے۔ یہ جھٹکا اس اضافی قوت کا نتیجہ ہے جو ہم نے بھرے ہوئے کنستر کے وزن کا اندازہ کر کے لگائی تھی لیکن جب وہ قوت استعمال نہ ہوسکی تو جھٹکے کی صورت میں خرچ ہوگئی۔

گرفت کی صلاحیت پر غور کیجئے۔ یہ عظیم نعمت ہے۔ مثالوں کے ساتھ لکھئے کہ تفکر کے دوران آپ کن احساسات سے دوچار ہوئے اور کیا انکشافات ہوئے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

”پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے معین مقداروں سے تخلیق کیا
اور ان مقداروں کی ہدایت بخشی۔“ (الاعلیٰ: ۱۔۳)

تفکر لکھ کر 15 دسمبر 2025ء تک بھیج دیجئے۔ (ادارہ — ماہنامہ قلندر شعور)

زندگی کا ساز

اکتوبر 2025ء کے "آج کی بات" پر تفکر سے قرطاسِ ابیض پر جو خیالات منتقل ہوئے، قارئین "ماہنامہ قلندر شعور" کی خدمت میں بصورتِ مضمون حاضر ہیں۔

زندگی آواز ہے۔ آواز میں لاشمار اقسام کے تصورات ہیں اور یہ تمام اقسام مخلوقات ہیں۔ مخلوق کے لیے چھوٹے بڑے ہر نظام کا انحصار آواز کی لہروں پر ہے۔ مثلاً ہم بات کرتے ہیں تو الفاظ کے لباس میں تصورات کسی تک پہنچاتے ہیں اور جسے دیکھتے ہیں، اس میں دَور کرنے والی فکر دماغ کی اسکرین پر اپنے تصورات ظاہر کرتی ہے۔ تصور باطنی مظہر ہے — اللہ تعالیٰ نے آواز کو تصورات کا ظاہری خول بنایا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ آواز خاموش ہو یا بولتی ہوئی، کائنات میں تصورات کی منتقلی کا ذریعہ ہے۔

ہر آواز کسی خواہش اور تقاضے کو ظاہر کرتی ہے — زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ظاہر ہونا اپنی ذات میں آواز ہے کیوں کہ ایک تقاضا ہے اور ایک اس کا مظاہرہ۔ تقاضے کو ظاہر کرنے کے لیے مظاہرہ بھی ارتعاش[1] پیدا کرتا ہے۔

ہم چلنے کے دوران قدموں کو شمار کرتے ہیں مگر ہر دو قدم کے مابین اس امر پر توجہ نہیں دیتے کہ قدموں کا درمیانی فاصلہ بھی آواز ہے۔ "آج کی بات" میں آوازِ دوست پر غور و فکر سے یہ اصول روشن ہوتا ہے:

"جب حرکت کا آغاز ہوتا ہے تو نتیجے میں کوئی اسپیس آواز سے خالی نہیں رہتی۔"

ازل کو یاد کیجیے اور ابد کا تصور کیجیے۔

ذہن نے ان الفاظ کے ساتھ سفر کیا۔

کائنات آواز (کُن) سے وجود میں آئی ہے، جس لمحے اس کی گونج رکے گی، وسیع و عریض

۱۔ Vibrations

کائنات اس حالت میں واپس چلی جائے گی جس حالت میں ظاہر ہونے سے پہلے تھی۔

قانون ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ کائنات ازل سے ابد تک آواز کی لاشمار طولِ موج یا ویولینتھ کا مظاہرہ ہے۔ جہاں جہاں ان لہروں کی طوالت کم[۲] ہوتی ہے، ان سے بنی ہوئی اشکال ہماری آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں جیسے اِس دنیا سے پہلے اور بعد کی دنیائیں اور اِس دنیا میں وہ مکانیت[۳] جن کو دیکھنے کی اہلیت ہم نے بیدار نہیں کی۔ جیسے جیسے لہر کا طول بڑھتا[۴] ہے، مناظر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ طول دوری کا نظام ہے جب کہ طوالت جتنی کم ہوتی ہے، ذہن اصل کے قریب رہتا ہے۔

محترم عظیمی صاحبؒ نے فرمایا،

"آج کی بات" سمجھ کر پڑھئے اور پڑھ کر سمجھئے ورنہ ذہن کے نشیب و فراز میں بات بھول کے خانے میں چلی جائے گی۔"

یعنی یہ گفتگو بہت باریک اور گہری ہے۔ اگر دھیان سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی تو دماغ کے الجھاؤ میں "بات" مخفی رہ جائے گی۔

آواز کی لہروں کا ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں داخل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ توانائی سفر کے دوران دائرے میں رہتی ہے اور طوالت کے اعتبار سے حالت کی تبدیلی سے گزرتی ہے۔ آخر میں اس حالت میں داخل ہو جاتی ہے جہاں ظاہر ہونے سے پہلے تھی مثلاً پیدا ہونا، تغیر سے گزرنا اور واپس جانا۔ یہ قانون زندگی، اسپیس اور کائنات کے نظام پر روشنی ڈالتا ہے کہ چھپنا بھی کہیں پر ظاہر ہونا ہے۔

ظاہر ہونے کے دو رخ ہیں۔

محوری اور طولانی۔

دونوں رخ دو دنیائیں ہیں۔

ایک دنیا میں حرکت مستقل اپنے مرکز سے رجوع میں ہے اور اُس دنیا کے مکین اِس نظام کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے رخ میں حرکت سیدھ میں آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے، یہ ادراک نہیں ہوتا کہ سیدھ کی سمت کیا ہے؟ اس رخ میں رہنے والے نہیں جانتے کہ طولانی حرکت دائرے کے محور پر قائم ہے یعنی ظاہری دنیا — باطنی دنیا سے جڑی ہوئی ہے اور اس کی بنیاد پر حرکت میں ہے۔

۲۔ High frequency ۳۔ اسپیس ۴۔ Low frequency

طولانی حرکت کو اصل سمجھنے سے فہم اطلاع کے سرچشمے سے دور ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ذاتِ واحد اللہ کے علم و قدرت پر غور و فکر کیا جائے تو نظر وسیع میدانوں کی سیر کرتی ہے۔

"اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اسی کے مثل زمینیں بھی۔ اس کا حکم ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور اس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔" (الطّلاق: ۱۲)

صاحبِ علم و یقین نے فرمایا،

"آدمی تصویروں کو حرکت میں دیکھتا ہے لیکن حرکت جس آواز پر متحرک ہے، اسے نہیں سنتا۔"

یہ وہی بات ہے کہ ہم گھر یا سنیما میں فلم دیکھتے ہوئے تصاویر کو حرکت میں دیکھ کر بھول جاتے ہیں کہ یہ تصویریں ہیں جو کہیں سے آ رہی ہیں اور مظاہرہ کر کے لوٹ رہی ہیں۔ تصویر جس آواز پر متحرک ہے، اسے نہ سننے کا مطلب ہے کہ جو آواز تصویر کی زندگی بن رہی ہے، ہماری سماعت اسے سننے سے عاجز ہے۔

یہ رویہ ہمارا اپنے لیے بھی ہے۔ ایسے میں کیسے علم ہوگا کہ زندگی کیا ہے!

اسی لیے شاعر نے کہا ہے،

؎ زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

زندگی مسلسل اپنے ہونے کی خبر دے رہی ہے لیکن ہم کان اور آنکھ بند کیے بیٹھے ہیں، سمجھ بوجھ پر محدود یعنی مفلوج طرزِ فکر کا پردہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی کی آواز جس ویولینتھ میں بج رہی ہے، ہماری سماعت اس سے نامانوس ہے۔ لگتا یہ ہے کہ جاننے کی کوشش بھی نہیں ہے۔

آواز باطنی توانائی ہے۔ مثلاً ہم بیٹھے ہوئے اور کسی کام میں مصروف ہیں۔ خیالات آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ خیال کا آنا لاشعور کی آہٹ ہے۔ متوجہ ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ کون آیا ہے اور کیا پیغام لایا ہے۔ "آہٹ" سے "علم ہونے" تک کے سفر کی درجہ بندی ہے۔

خیال سے پہلے ایک دستک ہوتی ہے جو عمومی طور پر ہم نہیں سنتے، اسے واہمہ کہتے ہیں۔
دستک کچھ گہری ہوتی ہے اور خیال بنتی ہے۔
خیال میں انہماک سے تصور واضح ہوتا ہے۔
تصور میں گہرائی کو مظاہرہ کہتے ہیں۔

آواز زندگی اور زندگی آواز ہے۔ اس کا ایک مشاہدہ ابو الانبیا حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ ہے۔

"اور جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میرے مالک! مجھے دکھادیں، آپ مُردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ فرمایا، کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا، ایمان رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔ فرمایا، اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کرلے پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے پھر ان کو پکار۔ وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔"

(البقرۃ: ۲۶۰)

اکتوبر 2025ء کے اداریے میں اس بصیرت افروز واقعہ کی حکمت پڑھی — بار بار پڑھی۔ علم ہوا کہ اس میں یقین کے اعلیٰ درجے کے حصول کا قانون، موت و زیست کے مراحل اور زندگی میں آواز کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔

"آج کی بات" کی ہر سطر میں کوئی نہ کوئی راز ہے۔ اس کی تفہیم کا چند صفحات میں احاطہ نہیں ہو سکتا۔ حاصلِ تفکر یہ ہے:

۱۔ تخلیقی نظام آواز پر قائم ہے۔

۲۔ آواز بکھرے ہوئے اجزا کو جوڑتی ہے۔

۳۔ اجزا کو ریزہ ریزہ کرتی ہے۔

۴۔ آواز زندگی کو موت اور موت کو زندگی میں داخل کرتی ہے۔

۵۔ پکار کے لیے انسیت ضروری ہے۔

۶۔ اللہ قدرت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ جسے چاہتا ہے، حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوتی ہے، وہ خیرِ کثیر سے نوازا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں بیان اس واقعہ میں زندگی، موت، حرکت، سکوت، آواز، آواز میں زندگی کے راز اور راز کا مشاہدہ ہے۔

رب العالمین اللہ نے کُن فرمایا۔ اس حکم کی بساط پر بزمِ کائنات ظاہر ہوئی اور اسی کی گونج میں زندگی ہر عالم میں سانس لے رہی ہے۔

ہر شے میں ہے سازِ ازل کی صدا
ہر ذرّہ کہتا ہے کُن فیکون!
خاموشی میں بھی ہے گفتگو
ہر سانس میں ہے ایک مکتومِ جنوں
صوتِ اوّل سے بنا نقشِ جہاں
بے نوا دل کو ملی تھی زباں
بود و نبود کی سرحد پہ
لہروں نے بُنا تھا جسم و جاں

ڈاکٹر نعیم ظفر

اک نور کی دنیا ہے کہیں پر آباد

آدمی کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر گاڑی ایٹموں سے بنی ہے، ایٹم روشنی سے بنا ہے تو گاڑی روشنی کی بنی ہوئی نظر کیوں نہیں آتی؟

کائنات میں لاشمار دنیائیں ہیں۔ کسی بھی دنیا میں مظاہرے کے لیے متعلقہ لہر کی توانائی ایک حالت یا زون سے دوسری حالت یا زون میں منتقل ہوتی ہے۔ زون نمبر (۱) کی بلندی سے توانائی کا کامل پیکٹ جب نزول کرتا ہے تو بلندی سے گریز کرتے ہوئے پیکٹ کی لطافت میں کمی آجاتی ہے۔ یہاں پر توانائی کا نیا پیکٹ گریز شدہ شکل میں اس قابل ہو جاتا ہے کہ زون (۲) میں داخل ہو سکے۔ غور کیجئے کہ لطافت میں کمی کس طرح واقع ہوتی ہے۔

توانائی کے پیکٹ کا دوسرے زون میں داخل ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب پیکٹ میں موجود انفارمیشن جس کی لطافت پہلے زون کی نسبت کم ہوگئی ہے، زون (۲) کی بلندی میں جذب ہو جائے — جذب ہونا تسلسل کے عمل کو یقینی بناتا ہے۔ یہ عمل آخری زون تک جاری رہتا ہے۔ بلندی سے پستی کے مابین توانائی کی روانی یا کرنٹ کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر زون عناصر کی مقداروں کا معین تناسب ہے۔ اس طرح یہ اصول سامنے آتا ہے کہ ہم غیب سے لمحہ لمحہ حاضر ہوتے ہیں یعنی ہر لمحہ انفارمیشن کی انرجی کے پیکٹ ایک زون سے دوسرے زون میں داخل ہوتے ہیں، پیکٹ کی ماہیّت میں تغیر واقع ہوتا ہے اور توانائی ہمارے حاضر (ظاہر) کی ایک جھلک بن جاتی ہے۔ پھر حاضر کا ہر لمحہ تسلسل سے غیب کی دنیا میں منتقل ہوتا جاتا ہے۔

کائنات کا چاہے کوئی زون ہو، مظاہر کی حالتیں موقع محل اور ٹائم اسپیس کی بندش میں ردّوبدل

ہوتی ہیں۔ اس میں بنیادی کردار توانائی کے نزولی عمل کا ہے۔ شے کی تشکیل و تحلیل اور توانائی و قوت کے کردار کو آپ نے مختلف زاویوں سے پڑھا۔ اس تناظر میں توانائی کی کُنہ سے واقف ہونے کا ذوق رکھنے والے خواتین و حضرات کے ذہن میں بنیادی سوالات اٹھتے ہیں۔

- تخلیق کی انفارمیشن کا سورس کیا ہے؟
- تخلیق کا میکانزم کیا ہے؟
- تخلیق و تولید میں کیا فرق ہے؟

الہامی کتابیں نظامِ تخلیق کو سمجھنے کی گائیڈ لائن ہیں مگر آج کی تحقیق و تلاش (سائنس) کا رویہ یہ ہے کہ وہ انہیں ماورائی و دیومالائی تصورات کہہ کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ ہر طبقۂ فکر کے محقق کی توجہ فلسفیانہ اور استدلال کی جانب نظر آتی ہے۔ وہ تہذیبیں جو لاکھوں سال پہلے سمندر میں غرق بتائی جاتی ہیں، اُن کے پتھروں پر کندہ علوم میں حقیقت کی تلاش کو ریسرچ مانا جاتا ہے جب کہ ہمارے پاس پانچ ہزار سال سے زیادہ پرانی تاریخ رقم نہیں، جو ہے، اس کی سند نہیں۔ غیر جانبداری سے سوچا جائے تو جس تاریخ کی سند نہ ہو، وہ غیر حقیقی تصورات نہیں کہلائیں گے؟ ان میں براعظم 'مو'، براعظم لیموریا اور افلاطون کی افسانوی شہنشاہیت اٹلانٹس شامل ہیں۔ ایسی ریسرچ کا حاصل اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے جب محقق دعویٰ کرتا ہے کہ یہ براعظم لاکھوں سال پہلے غرق ہوئے تھے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ غرق شدہ اقوام کا کوئی گواہ موجود نہیں۔

تحقیقی فکر حقیقت کی تلاش میں رہتی ہے جب کہ تنزل شدہ مظاہر حقیقت تک نہیں پہنچا سکتے مگر حقیقت کا سراغ ضرور دیتے ہیں۔ اس ضمن میں صدی در صدی تحریف شدہ کتب و نوادر کے بگڑے ہوئے تصورات کو گلے سے لگا کر اعلیٰ ڈگریوں اور اعزازات سے نوازا جاتا ہے، پھر دہائیوں بعد نظریات کو رد کر دیا جاتا ہے، ڈگریاں اور ایوارڈ دیوار پر سجے رہ جاتے ہیں۔

گر آنکھ شبہ کرے تو کس کا!

گلہ کرے تو کس کا!

مغرب کے تعلیم یافتہ محققین کہتے ہیں کہ آدمی کا وجود بیکٹیریا اور دیگر خردبینی مخلوقات کا ارتقائی پروسس ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو سوال ہے کہ بیکٹیریا اور دیگر خردبینی مخلوقات کے وجود کی اساس کیا ہے؟

یہ بتاتے ہیں کہ مادے کو ملی میٹر کے اربویں

حصے تک اُدھیڑا جا چکا ہے، آنکھ کو آدم کا ایٹم یعنی DNA نظر آنے لگا ہے۔ جین تھراپی سے آدمی کا DNA بدلنے کے بھی دعوے ہیں مگر DNA کے پسِ پردہ توانائی کا سراغ نہیں ملا۔

جانبدار تحقیق 'مادے میں روشنی کی زندگی' کو تلاش کر رہی ہے۔ مثلاً مالیکیولر بایولوجسٹ، وائرولوجسٹ اور دوسرے محققین توانائی کے اس خلا کی نشاندہی کرتے ہیں مگر مادے سے بلند اور مادے سے لطیف میڈیم کی طرف تحقیق کا رخ نظر نہیں آتا۔ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ ایک رباعی میں فرماتے ہیں،

جب آنکھ شبہ کرے، شبہ کس کا ہے
انساں جو نہ سمجھے تو گلہ کس کا ہے
اک نور کی دنیا ہے کہیں پر آباد
کچھ علم نہیں ہے، وہ صلہ کس کا ہے

فی زمانہ طبیعیات دان مظاہر کو مادے کی ایٹمی تشکیل مانتے ہیں۔ ایٹم کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا مگر الیکٹران اور دیگر ایٹمی ذرّات کے روشنی کے بادلوں کی تصاویر تحقیقاتی جرنلوں میں شائع کی جاتی رہی ہیں۔ تصاویر کتنی حقیقی ہیں، یہ اپنی جگہ سوال ہے۔ سَرن لیب —سوئٹزرلینڈ میں 27 کلومیٹر گول سرنگ میں اِسراعی ذرّات[1] سے مادے کو مزید توڑنے کی کوشش جاری ہے۔

آدمی کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر گاڑی ایٹموں سے بنی ہے، ایٹم روشنی سے بنا ہے تو گاڑی روشنی کی بنی ہوئی نظر کیوں نہیں آتی؟ محقق کہتے ہیں کہ اگر آپ الیکٹران خردبین استعمال کریں تو وہ روشنی کی بنی نظر آئے گی۔ سوال یہ ہے کہ روشنی کس سے بنی ہے؟ جواب میں کہا جاتا ہے، 'اس پر ریسرچ جاری ہے'۔

محقق جانتے ہیں کہ الیکٹرانی خردبین میں جو روشنی استعمال ہوتی ہے، وہ مادی ہے۔ اس کی وجہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ چوں کہ الیکٹران کی ایک کمیت[2] ہے، وزن ہے، سائز ہے اور رفتار کی وجہ سے اُس میں سے چارج اور روشنی پھوٹتی ہے، الیکٹران میں کشش ہے، گریز ہے۔ منطق یہ کہتی ہے کہ کثیف مادے سے شے کی کثافتی ساخت کو کسی حد تک ڈھونڈ سکتے ہیں مگر اُس کے لطیف گوشے مادی روشنی کے سائے کی وجہ سے اوجھل رہیں گے۔ کوئی بھی شے جو تغیر کے نتیجے میں پیدا ہو رہی ہو، کسی بھی صورت میں

۱۔ وہ ذرّات جن کی رفتار کسی توانائی کے ذریعے عام حالت سے کہیں زیادہ بڑھا دی گئی ہو۔ ۲۔ Mass

حقیقت تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ قانون ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اور جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔" (النحل: ۲۰)

آخری آسمانی کتاب قرآن کریم کی روشنی میں ان نظریات کی نفی ہو جاتی ہے جو قانون بقائے توانائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ توانائی نہ پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ فنا لیکن ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کی جا سکتی ہے۔ توانائی کا لامحالہ کوئی سورس ہے جو تسلسل سے معلوم و نامعلوم کائنات اور مظاہر میں حرکت کا سبب ہے۔ اگر توانائی کا کرنٹ معطل یا بند ہو جائے تو مظاہر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ توانائی کے نزولی نظام میں کچھ ایسا ہے جو قیام پذیر نہیں ہے کیوں کہ مخلوق کی نشوونما یا ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ نزول میں تسلسل ہو۔

انفارمیشن کے مظہر کو آدمی نے ٹیکنالوجی کے ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایسے ادوار کو محققین پتھر کا دور، لوہے کا دور، تانبے کا دور یا فی زمانہ سلیکان کا دور کہتے ہیں لیکن تمام ادوار توانائی کے کرنٹ کے تسلسل کے محتاج رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے اہرامِ مصر کی تہذیب کے آثار ہیں حتیٰ کہ اُس دور کے آدمیوں کے ڈھانچے یا ممیاں بھی ہیں مگر ایسی کوئی ٹیکنالوجی ابھی تک سامنے نہیں آئی جو ان آثار میں توانائی اور زندگی کی سرگرمی واپس لا سکے!

سماوات و ارض کے درمیان جو کچھ ہے، فنا و بقا سے گزر رہا ہے، ٹائم اسپیس میں بند زون در زون حرکت میں ہے، لمحہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پیدا ہو رہا ہے، نمو پا رہا ہے اور غائب ہو رہا ہے۔ ہماری حیثیت صرف شاہد کی ہے۔

مادے کی تمام تر توانائیوں میں بلندی و پستی ہے، شدت و لطافت کا فرق ہے۔ واضح رہے کہ کائنات کا ہر جُز توانائی یا انفارمیشن کی لہر کا مظہر ہے۔ جہاں توانائی کی لطافت میں کمی بیشی ہوتی ہے، مظہر کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ یہ فرق توانائی کی منتقلی کے لیے ضروری ہے۔ کائنات کے جس زون میں ہم رہتے ہیں، صاحبِ حال اسے عالمِ ناسوت کہتے ہیں۔ ناسوت کی تخلیقی ایکویشن میں توانائی کے تنزل کا فارمولا شامل ہے۔

محقق مادے میں توانائی یا روشنی کے متلاشی ہیں۔ سب کے ذہن میں مشترک سوال ہے کہ

خیال کہاں سے آتا ہے؟ زندگی کا سورس کیا ہے؟ محقق اگر تلاش میں مخلص ہیں تو حقیقت تک پہنچنے کا راستہ "صراطِ مستقیم" ہے۔

ہر کام کا اسٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجر یا SOP ہوتا ہے۔ اس تلاش میں جب ہم خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہیں، قرآن کریم متقیوں کے لیے گائیڈ بک ہے اور متقی خواتین و حضرات اللہ کو جاننے کا ذوق رکھتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

"یہ کتاب، اس میں شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔" (البقرۃ: ۲)

مادی فکر توانائی کے مادی رخ میں قید ہے جب کہ پیغمبرانہ تعلیمات خالقِ کائنات اللہ کی تخلیقات پر غور کرنے کا درس دیتی ہیں۔ تحقیق کا یہ راستہ اس فکر سے آزاد کر دیتا ہے جس سے آدمی تنزل کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ دوسری طرف اللہ کی جانب رجوع کرنے والا اندھا بہرا بن کر نہیں رہتا، غور و فکر کرتا ہے۔

"جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔" (الفرقان: ۷۳)

قرآن کریم کے مطابق حضور پاکؐ کی سنت پر عمل کر کے انسان اور جنات زہد کے ایسے درجے پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سلطان کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ سلطان کیا ہے؟

قرآن کریم میں تفکر سے راہ نمائی ملتی ہے کہ سلطان ایسا وصف ہے جس کی صلاحیتوں سے وہ اوصاف بیدار ہوتے ہیں جو تنزل کے زون سے آزاد کر دیتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے،

"اے گروہِ جن و انس! تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل کر دکھاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔" (الرحمٰن: ۳۳)

درویش سے ظاہر پرست نے کہا، میرے پاس مال و دولت ہے، آپ کے پاس علم ہے۔ میں خوش ہوں، آپ بھی خوش ہیں۔ ہم دونوں میں زیادہ خوش قسمت کون ہے؟

درویش نے کہا، تمہارے پاس مٹی کی، میرے پاس سکون کی دولت ہے۔ ضرورت تمہاری پوری ہوتی ہے اور میری بھی لیکن میری خوشی کو قیام ہے — تمہاری خوشی میں اضطراب ہے۔

عظیمی

روغن گلوسبز

پُرسکون نیند لاتا ہے

سر کے جملہ امراض اور

ہائی بلڈ پریشر میں مفید ہے

چاند کی کرنیں جذب کر کے تیار کیا جاتا ہے

125ml

Rs. 500

پاکستان بھر میں ہوم ڈلیوری کی سہولت

0332 308 5058

انیسہ عرفان

سلطان الہند

"رخصت کرتے وقت مرشد کریم نے مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ سر اور آنکھوں کو بوسہ دیا اور فرمایا، تجھے خدا کے سپرد کیا۔ اور عالمِ تحیر میں مشغول ہو گئے۔"

سلطان الہند — خواجہ غریب نوازؒ کا اسمِ گرامی حسن اور لقب معین الدین ہے۔ نجیب الطرفین سادات ہیں۔ 1141ء کو ایران کے صوبہ سیستان کے شہر سنجر[1] میں پیدا ہوئے۔ والد محترم سید غیاث الدینؒ صاحبِ ثروت اور عبادت گزار تھے۔ والدہ ماجدہ کا نام بی بی ماہ نورؒ تھا۔ خواجہ معین الدینؒ کی ولادت ایسے دور میں ہوئی جب ہر طرف ابتری تھی۔ حسن بن صباح کی فوج نے سنجر پر حملہ کیا تو خواجہ معین الدینؒ کی عمر لگ بھگ تیرہ سال تھی۔ حالات کی وجہ سے والد نے اہلِ خانہ کے ہمراہ نیشاپور ہجرت کی جہاں دو سال بعد والد اور اس کے ایک سال بعد والدہ کا انتقال ہو گیا۔ پے در پے صدمات کے نتیجے میں آپ خاموش رہنے لگے۔

خواجہ معین الدینؒ نے باغبانی کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ایک روز حضرت ابراہیم قندوزیؒ تشریف لائے تو آپ نے انہیں درخت کے سائے میں بٹھایا اور انگور کے خوشے پیش کئے۔ بزرگ نے انگور چکھے پھر تھیلی سے کھَلی کا ٹکڑا نکالا، چبایا اور خواجہ صاحبؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا،

"وہ تیری مہمان نوازی تھی،
یہ فقیر کی دعوت ہے۔"

خواجہ معین الدینؒ نے تکلّف کے بغیر فقیر کا تبرک قبول کیا۔ حضرت ابراہیم قندوزیؒ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

کھَلی کا ٹکڑا کھاتے ہی اندر میں تبدیلی محسوس ہوئی اور — دل رنگوں کے ہجوم سے نکل کر "بے رنگی" کی طرف مائل ہوا۔ باغ فروخت

۱۔ سنجر کو سلجوقیہ خاندان کے حکمران سلطان سنجر نے گیارہویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔

کرکے سمرقند و بخارا کا رخ کیا۔ وہاں دو سال مولانا حسام الدین بخاریؒ کی شاگردی اختیار کی، تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم پڑھے۔ بعد ازاں علمِ ریاضی، فلکیات اور علمِ طب حاصل کیا۔ یہاں سے بغداد روانہ ہوئے جہاں مسجد جنید بغدادیؒ میں سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ خواجہ عثمان ہارونیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت عمر 18 سال تھی۔

اللہ کے دوست — خانوادہ سلسلۂ عظیمیہ، حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ نے کتاب "احسان وتصوف[۲]" میں تحریر فرمایا ہے،

"خواجہ عثمان ہارونیؒ نے بیعت کرنے کے بعد انہیں خانقاہ میں پانی بھرنے کی ذمہ داری سونپ دی — دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ کم و بیش 22 سال خواجہ معین الدینؒ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔"

—◎—

عمر 40 سال ہوئی تو ایک روز پیر و مرشد نے بلایا اور پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟

عرض کیا، خادم کا نام معین الدین ہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نگاہ سے حجابات اٹھنے کا اپنی تصنیف "انیس الارواح" میں تذکرہ فرمایا ہے۔ مختصراً پیشِ خدمت ہے۔

"پیر و مرشد نے فرمایا، دو رکعت نماز ادا کرو۔

میں نے ادا کی۔

پھر فرمایا، قبلہ رو بیٹھ جا۔ میں بیٹھ گیا۔

حکم دیا، سورۃ البقرۃ پڑھ۔ میں نے پڑھی۔

فرمان ہوا، 21 مرتبہ درود شریف پڑھ۔

میں نے پڑھا۔ پھر وہ کھڑے ہوئے۔ اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا،

'آ کہ تجھے اللہ کے حضور میں پہنچادوں۔'

پھر فرمایا، آسمان کی طرف دیکھ!

میں نے دیکھا۔

پوچھا، کہاں تک دیکھتا ہے؟

عرض کیا، عرشِ عظیم تک دیکھ رہا ہوں۔

فرمایا، زمین کی طرف دیکھ۔ میں نے دیکھا۔

فرمایا، کہاں تک دیکھتا ہے؟

عرض کیا، تحت الثریٰ تک دیکھ رہا ہوں۔

فرمایا، سورۃ الاخلاص پڑھ۔ میں نے پڑھی۔

فرمایا، دوبارہ آسمان کی طرف دیکھ۔

پوچھا، اب کہاں تک دیکھتا ہے؟

۲۔ کتاب "احسان وتصوف" بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں M.A. اسلامیات کے نصاب کا حصہ ہے۔

عرض کیا، حجابِ عظمت تک۔

فرمایا، آنکھیں بند کر۔ آنکھیں بند کر لیں۔

فرمایا، آنکھیں کھول دے۔ تعمیل کی۔

اپنی دو انگلیاں دکھا کر پوچھا، کیا دیکھتا ہے؟

عرض کیا، 18 ہزار عالمین نظر آرہے ہیں۔

جوں ہی یہ عرض کیا، فرمایا، جاؤ — تمہارا کام مکمل ہوگیا۔ پھر سامنے پڑی اینٹ اٹھانے کا حکم دیا۔ اینٹ اٹھائی تو مٹھی بھر دینار برآمد ہوئے۔

فرمایا، اسے فقرا میں تقسیم کر دو۔

دینار تقسیم کر دیے۔"

جب خواجہ عثمان ہارونیؒ خانہ کعبہ کی طرف عازمِ سفر ہوئے تو مریدِ خاص ہمراہ تھے۔ سفر کے بارے میں خواجہ معین الدینؒ فرماتے ہیں،

"سفر کے دوران ہم ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں اللہ کے چند مقرب بندوں سے ہماری ملاقات ہوئی جو ابھی عالمِ سکر میں تھے، ہوش میں نہیں تھے۔ چند روز ان کے ہمراہ رہے لیکن وہ اسی حال میں رہے۔ پھر ہم وہاں سے بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے گئے۔ وہاں پیر و مرشد نے میرا ہاتھ پکڑا اور میزابِ رحمت کے نیچے میرے لئے دعا کی۔ آواز آئی،

'ہم نے معین الدین کو قبول کیا۔'

وہاں سے خاتم النبیین حضرت محمدؐ کے روضہ مبارکؐ کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ پہنچے۔

پیر و مرشد نے فرمایا، سلام پڑھو۔

میں نے سلام پڑھا۔ آواز آئی،

'اے قطب مشائخ بحر و بر! وعلیکم السلام'

جب یہ آواز آئی تو پیر و مرشد نے فرمایا،

اب تمہارا کام ہوگیا۔"

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیر و مرشد کے ہمراہ متعدد سفر کئے۔ جب ظاہری جدائی کا وقت آیا تو وہ فرماتے ہیں،

"رخصت کرتے وقت مرشد کریم نے مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ سر اور آنکھوں کو بوسہ دیا اور فرمایا، تجھے خدا کے سپرد کیا۔ اور عالمِ تحیر میں مشغول ہوگئے۔"

مرشد سے رخصت ہوکر بیت اللہ شریف حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی شہروں اور ملکوں سے گزر ہوا۔ اصفہان میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آپ سے

بیعت کی درخواست کی۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کو آپ کے خلیفۂ اول ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ سفر میں شریک ہوئے اور مکہ معظمہ پہنچے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ میں حاضری دی جہاں مسجد نبویؐ میں مراقبہ اور مشاہدہ میں مشغول رہے۔

شرفِ زیارت حاصل ہوا۔

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

"اے معین الدین! تو میرے دین کا معین ہے۔ میں نے ولایتِ ہندوستان تجھے عطا کی۔ وہاں کفر و ظلمت پھیلی ہوئی ہے۔ تو اجمیر چلا جا۔ تیرے وجود سے ظلمتِ کفر دور ہوگی اور اسلام رونق افروز ہوگا۔"

خواجہ غریب نوازؒ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی — انہیں اجمیر کے اردگرد قلعے اور کوہستان دکھائے گئے اور اسی خواب میں رسول کریمؐ نے جنت کا ایک انار عطا فرمایا۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ مدینہ منورہ سے بغداد تشریف لے گئے، وہاں سے افغانستان کے راستے لاہور پہنچے جہاں حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور چلّہ کیا۔ اس کے بعد پانچ سال ملتان میں قیام فرمایا۔ وہاں سنسکرت اور دوسری مقامی زبانیں سیکھیں، اس کے ساتھ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور عقائد سے واقفیت حاصل کی۔ یہاں سے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے جہاں اُس وقت پرتھوی راج چوہان کی حکومت تھی۔

سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بہت سی کرامات صادر ہوئیں۔ ان میں سے چند کرامات پیشِ خدمت ہیں۔

★ خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر تشریف لائے تو ایک میدان میں آرام کے لئے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ راجا کے ملازم آئے اور کہا، یہاں راجا کے اونٹ بیٹھتے ہیں۔ خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا، ہم مسافر ہیں، آرام کی غرض سے بیٹھے ہیں۔ جب سپاہی بضد رہے تو فقیر نے شانِ بے نیازی سے فرمایا،

"اچھا، اونٹ بیٹھتے ہیں تو بیٹھیں۔"

یہ فرما کر وہ انا ساگر کے کنارے تشریف لے گئے۔ جب راجا کے اونٹ چراگاہ سے واپس آئے تو اگلے روز اٹھ نہیں سکے۔ ساربانوں نے بہت کوشش کی لیکن زمین نے جیسے اونٹوں کے پیر جکڑ لیے تھے۔

پرتھوی راج کو صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جاکر فقیر سے معافی مانگو۔

ساربان حاضر ہوئے اور گستاخی پر معافی مانگی۔ خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا،

"جاؤ، تمہارے اونٹ کھڑے ہیں۔"

وہ واپس گئے تو اونٹ کھڑے تھے۔

علاقے میں خبر پھیل گئی تھی — ہندوستان کے لوگوں کا خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حلقے میں داخل ہونے کا آغاز ہوگیا تھا۔

★ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اناساگر کے کنارے قیام فرمایا۔ آپ کے ساتھی تالاب سے پانی لیتے تھے جو علاقے کے بااثر لوگوں کو ناگوار گزرتا تھا۔ انہوں نے پانی لینے سے روک دیا۔ خواجہ صاحبؒ نے ایک خادم سے فرمایا کہ جاؤ، اناساگر سے پانی بھرلاؤ۔ جب کوزہ تالاب میں ڈالا تو سارا پانی کوزے میں آگیا — تالاب خشک ہوگیا۔ خبر پھیل گئی۔ لوگوں نے معافی مانگی ۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خادم سے فرمایا کہ کوزے کا پانی تالاب میں ڈال دو۔

تالاب لبالب بھرگیا۔

★ ایک دن ایک سادھو خواجہ غریب نوازؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ گیان میں اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں مقابل آئینے کی طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ خواجہ صاحبؒ کا وجود نور سے پُرنور ہے لیکن دل میں چھوٹا سیاہ دھبّہ ہے۔ مشاہدہ بیان کیا تو خواجہ صاحبؒ نے فرمایا، تونے سچ کہا ہے۔ سادھو نے عرض کیا، آپ جیسی روشن ہستی کے دل میں یہ سیاہ دھبّہ اچھا نہیں لگتا۔ کیا میری روحانی طاقت سے یہ دور ہوسکتا ہے؟ فرمایا، تو چاہے تو یہ سیاہی دور ہوسکتی ہے۔ سادھو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عرض کیا، میری زندگی آپ کی نذر ہے۔ خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا:

اگر تو خاتم النبیین حضرت محمدؐ پر ایمان لائے تو یہ دھبّہ مٹ جائے گا۔

سادھو بات سمجھ نہیں سکا لیکن اس نے سچائی کو پہچان لیا تھا، ایمان لے آیا۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا، آتما کی آنکھ سے اندر دیکھ۔ سادھو نے دیکھا کہ دل سیاہ دھبّے سے پاک اور روشن تھا۔ خواجہ اجمیریؒ نے سادھو کی درخواست پر راز پر سے پردہ اٹھایا اور فرمایا،

"وہ روشن آدمی جس کے دل پر تونے سیاہ دھبّہ دیکھا تھا تُو خود تھا لیکن اتنی شکتی کے بعد بھی تجھے روحانی علم حاصل نہیں ہوا۔ وہ علم یہ ہے کہ آدمی کا دل آئینہ ہے اور ہر دوسرے آدمی کے آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آتا ہے۔ تُو

نے اپنی روشن آتما میرے اندر دیکھی تو تجھے اپنا عکس نظر آیا۔ تیرا ایمان خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی رسالت پر نہیں تھا اس لیے تیرے دل پر سیاہ دھبّہ تھا۔ جب تو نے کلمہ پڑھ لیا تو تجھے میرے آئینے میں اپنا عکس روشن نظر آیا۔"

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ثابت قدمی سے علم و محبت کی روشنی پھیلاتے رہے، لوگ حلقۂ ارادت میں داخل ہوتے رہے۔ اولیاء اللہ کی روایت کے مطابق، آپ نے خانقاہ میں لنگر جاری کیا، بلاتفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل سب مستفیض ہوئے۔ اللہ کے دوستوں کی ایک کرامت یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے والا کوئی فرد خالی نہیں لوٹتا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سب کو محبت و شفقت سے نوازا، دکھ کا مداوا کیا، دل جوئی کی، علم کے متلاشی کو علم سے سیراب کیا۔ آپ عوام و خواص میں خواجہ غریب نوازؒ کے لقب سے معروف ہوئے۔ آپ نے لاشمار لوگوں کو اللہ کی محبت سے سرشار کیا۔

وصال کی شب عشاء کی نماز پڑھ کر حجرے میں تشریف لے گئے۔ صبح فجر کے وقت دروازہ نہیں کھلا تو خادموں کو فکر ہوئی۔ حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے آواز نہیں آئی۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ مرشد کا وصال ہو گیا تھا۔ سید محمد بن مبارک کرمانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ اس وقت آپ کی پیشانی پر یہ تحریر روشن تھی،

حبیب اللہ مات فی حب اللہ

ترجمہ: اللہ کے دوست نے — اللہ کی محبت میں وفات پائی۔"

خواجہ غریب نوازؒ فرماتے ہیں،

① قرآن کریم کی تلاوت کے وقت دل نرم اور پُرگداز ہونا چاہئے۔

② نماز کی پابندی کے بغیر کوئی شخص بارگاہِ الٰہی میں مقبول و محبوب نہیں ہوسکتا۔

③ بد، نیک صحبت میں بیٹھے تو نیک اور نیک، بروں کی صحبت میں بیٹھے تو بد ہو جاتا ہے۔

④ جس شخص میں تین باتیں ہوں، اللہ اسے دوست رکھتا ہے۔ سمندر جیسی سخاوت، مہتاب جیسی شفقت اور زمین جیسی تواضع۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰسٓ شریف ، قرآن کریم کا مکمل نسخہ اور ۳۰ سپاروں کا سیٹ

دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ساتھ اندرونی صفحات میں
خوب صورت ڈیزائن کردہ خط (font)
جس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ آیات بآسانی پڑھی جاسکیں۔
زیادہ سے زیادہ لوگوں میں ایصالِ ثواب کے لئے تقسیم کیجئے۔

ملنے کا پتہ:

عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4، سرجانی ٹاؤن، کراچی، پاکستان۔

+92-(0)21-36417843
+92-(0)305-4435207

عظیمی
عظیمی یونیورسٹی پریس®
AZEEMI UNIVERSITY PRESS

زیرِ سرپرستی خانوادہ سلسلہ عظیمیہ

★ قلندر شعور اکیڈمی ★

مراقبہ ہال حیدرآباد

قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔

★ ★ ★

روحانی علوم کے متلاشی، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے خواتین وحضرات کے لئے خوش خبری

گلشنِ شہباز، نزد ٹول پلازہ، جامشورو حیدرآباد، 71000، پاکستان
فون نمبر: 0331-3615533 ، 0333-2695331

تجمل
Tajammal
TRAVELS (PVT) LTD.

IATA
ACCREDITED AGENT
IATA Code: 27342433

تجمل ٹریولز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تجمل للسفريات (الخاصه) المحمدوده

ویزہ + ایئرلائن ٹکٹ

ہوٹل + زیارات ٹرانسپورٹ

UMRAH
عمرہ سروس

بجٹ پیکج
اکانومی پیکج

5 ہوٹل کی بکنگ

ٹی ایچ اے اوورسیز ایمپلائمنٹ پروموٹرز

شبعة تی ایچ اے ⟨THA⟩ لتطور الامور تتعلق بالعمال/الموعطفين الاجانب

THA
OVERSEAS EMPLOYMENT PROMOTERS
Licence No. 4189/LHR
⟨خصة تسعة:۴۱۸۹/ایل ایچ آر

- Labour Visa
- Skilled Visa
- Un Skilled Visa

thaoep1@gmail.com

متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر
ملائشیا، میں ملازمت کے شاندار مواقع

رانا تجمل حسین
CEO

+92 300 6654 211
+92 302 1165 300
+92 321 6680 266
+92 41 2641 904

Office No. 54, Gate No. 5, Iqbal Stadium. Faisalabad. PK

Canderel®

with Stevia

Naturally Sweet

Zero Calorie Sweetener

Available in Tablets, Sachets and Jars

SEARLE

ڈاکٹر مکاشفہ نعیم
(اسپین)

رملینہ ــــ صحرا کی شہزادی

رملینہ عربی لفظ رمل سے ماخوذ ہے۔ معنی ریت یا صحرا ہے اور رملینہ ــــ صحرا کی شہزادی ہے۔
وہ ظاہر میں سیاح مگر باطن میں سالک ہے۔ پیرس کی ایک درس گاہ میں آرٹیفیشل انٹیلی جنس کی طالبہ ہے جو تعطیلات میں دنیا کی سیر پر نکلتی ہے مگر اندر میں درویشہ بن چکی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ علم کیا ہے اور کیوں ہے۔ یہ کہانی محض جغرافیائی مقامات کا خاکہ نہیں بلکہ باطنی سیاحت ہے جس کے ہر مقام، ہر لمحے اور ہر مکالمے میں رمز ہے۔ کہانی حقیقی ہے، مقامات پر کہیں کہیں پردہ رکھا گیا ہے۔ یہ روداد بتاتی ہے کہ خود سے گزر کر ایک دروازہ کھلتا ہے جس کی ہر منزل راستے کا شعور اور ایک نئے سفر کا آغاز ہے۔ جب راہی راستہ بن جائے اور راہ سے بڑھ کر راہ نما کی طلب میں ڈھل جائے ــــ وہ رملینہ بن جاتا ہے۔

کہیں نہ کہیں، نین مینڈول کی تلاش کے خیال نے اندر میں تشنگی کو ظاہر کیا تھا ــــ فکری اور روحانی تشنگی۔

رملینہ اور دوستیں دوپہر کا کھانا کھانے میں محویت سے مشغول تھیں۔ جس گہری فکر کے ساتھ وہ کھانا کھا رہی تھیں، یہ معدے کے ساتھ ساتھ زبان، دل اور دماغ کی تسکین بن گیا تھا۔

لیک ویو ہاؤس پر موجود تمام مہمان فرانس کی پیرس یونیورسٹی میں AI کے طالب علم تھے۔ میزبان رملینہ والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کی زندگی حادثے نے چھین لی مگر اپنا خواب اور شعور بیٹی کو دے گئے۔ والد یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ رملینہ کو سیاحت، جمالیات اور سوالات سے لگاؤ والد سے ورثے میں ملا تھا۔

ظاہر میں رملینہ کی زندگی مصروف تھی اور کامیاب بھی مگر آنکھوں میں سوال رہتا تھا جو منطق سے نہیں، کسی تعلق اور نسبت سے سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ اُس دنیا میں رہتی تھی جہاں منطق بے معنی تھی ــــ دل چاہت میں بھیگا رہتا تھا۔

صوفیہ گہری سوچ میں بولی: مراکشی چائے کا

ایک اور دَور ہونا چاہیے۔

زارا اور ایشلین نے فوراً کیتلی کا بٹن دبا دیا۔ اس دوران ایشلین نے عالیہ سے رازدارانہ لہجے میں کہا: رملینہ نے نین مینڈول پر گہری ریسرچ کی ہے... AI ٹولز، ڈیجیٹل لائبریری یہاں تک کہ ہولوگرافک ملاقات کا انتظام بھی۔

سب چونک گئیں۔

واقعی؟ ہمیں کیسے پتہ چلے؟

ایشلین نے ہنستے ہوئے کہا: لیڈیز اینڈ لیڈیز، رملینہ آپ کو خود بتائے گی۔ اور ہاں، ریکارڈنگ بھی دکھائے گی۔

رملینہ نے خاموشی سے اپنا ٹیبلٹ ایشلین کو دیا جس نے توقف کے بغیر بیٹھک میں لگی بڑی اسکرین پر ویڈیو ریکارڈنگ چلا دی۔

اسکرین پر پیرس یونیورسٹی کی لائبریری اور آرکیالوجی سینٹر کا logo نمودار ہوا پھر دھندلا سا منظر جس کے بعد ایک ہولوگرافک چہرہ۔ یہ پروفیسر جین ایوز کا مسکراہٹ سے بھرپور ہیولا تھا جو نین مینڈول کی روحانی و علمی گہرائی کی جانب رملینہ کو دعوت دے رہا تھا۔

جین ایوز استقبال کرتا ہے:

سلام، رملینہ! تم وہی ہو نا جس نے نین مینڈول کے بارے میں پوچھا تھا؟

رملینہ حیران لیکن مسرور، جواب میں کہتی ہے: جی، میں وہی ہوں، کیا واقعی آپ جین ایوز ہیں؟ نین مینڈول کے ماہر؟

جین ایوز (ہنستے ہوئے): بس سمجھو، میں اس کا ایک عکس ہوں — ہولوگراف میں زندہ لیکن یادداشت میں مکمل۔ تمہیں اُس شہر کے بارے میں بتاؤں گا جو سمندر کے اندر چھپ گیا مگر آج بھی سانس لے رہا ہے۔

نین مینڈول — وہ شہر جسے 'پیسیفک کا وینس' کہا جاتا ہے۔ یونیسکو کا عالمی ورثہ، صدیوں پرانی سلطنت ساودیلور[1] کا دارالحکومت۔ مشکل سے یقین آتا ہے مگر حقیقت ہے۔ وفاقی مائیکرونیشیا کے تقریباً 92 مصنوعی جزیرے، بازالٹ[2] کے ستون اور پانیوں کے درمیان مکمل تہذیب۔

رملینہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولی: اتنے جزیرے؟ وہ بھی آدمیوں کے بنائے ہوئے؟

۱۔ Saudeleur ۲۔ (بسالٹ۔ آتش فشانی پتھر جو سطحِ زمین پر لاوے کے ٹھنڈا ہونے سے بنتا ہے۔)

جین ایوز نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ان کی تعداد 90 سے تجاوز کرتی ہے۔ یہ سب Temwen Island کے قریب ہیں۔ شہر لگ بھگ 1.5 کلو میٹر طویل اور آدھا کلو میٹر چوڑا تھا۔ یہ معمولی تعمیر نہیں تھی۔ نین مینڈول کی عمارتیں دہری دیواروں، مستطیل چبوتروں اور خفیہ راستوں سے آراستہ تھیں — بلندی 16 سے 29 میٹر تک تھی۔ کچھ ستون 40 فٹ تک بلند تھے۔

رملینہ جو محویت سے سن رہی تھی، کہنے لگی: اور وہ پتھر؟ کیا واقعی اتنے بھاری تھے؟

جین ایوز نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا: بالکل۔ بازالٹ کے ستون بعض مقامات پر 50 ٹن سے زیادہ وزنی تھے اور حیرت کی بات — یہ جزیرے ان پانیوں میں قدرتی طور پر موجود نہیں تھے۔ انہیں کہیں اور سے لایا گیا تھا۔ کیسے؟ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

رملینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کیا واقعی کچھ عمارتیں پانی کے نیچے ہیں؟

جین ایوز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ہاں! نین مینڈول کے کچھ ستون 25 میٹر یعنی 82 فٹ تک گہرائی میں ملے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر — شمال مشرق میں ایک اور داستانی مقام ہے، کاہنی ہموئیسو — تقریباً 50 میٹر یعنی 164 فٹ کی گہرائی میں۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہ شہر نیند میں سانس لے رہا ہے۔

رملینہ کا تجسس بڑھ گیا۔ اس نے پوچھا، کیا ہر جزیرے کو آباد کرنے کا کوئی مقصد تھا؟

جین ایوز نے کہا: سمندر کے بیچ تمام جزائر فرش سے چھت تک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اور نقشے کے تحت بنائے گئے تھے۔ جیسے،

نانداوواس: بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں کے لیے مخصوص مرکزی جزیرہ۔ اگر تم دیکھو تو یہ اونچی دیواروں سے گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

پہانکادیرا: یہ جزیرہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کا مقام مانا جاتا ہے۔ یہاں جگہ جگہ قربان گاہیں، عبادت گاہیں اور خانقاہ نما کمرے ہیں۔

پنکائیتل اور پنائیرنج: یہ جزیرے ممکنہ طور پر مخصوص خاندانوں یا سرداروں کی رہائش گاہیں بتائی جاتی ہیں۔ ان کے نقشے بقیہ رہائشی علاقوں سے مختلف ہیں۔

طرح طرح کے سمندری درختوں پر مشتمل رہائشی علاقے ایسے بھی ہیں جن کے درمیان 40 سے 50 فٹ طویل سمندری کینال بہ رہی ہے۔ غوطہ خوروں نے بتایا ہے کہ ساحل سے

متصل بہت سے مقامات پر تعمیراتی اسٹرکچر 50 سے 70 فٹ تک زیرِ آب ہے۔

قبرستان جزائر: ان مخصوص جزائر پر بادشاہوں اور دانشوروں کی قبریں ملی ہیں۔ ان کے ڈھانچے دیکھنا چاہو تو وہاں کے عجائب گھر جانا ہوگا کیوں کہ وہ آن لائن دنیا سے دور ہیں۔

آبی گزرگاہیں: جزیروں کے درمیان نالے اور نہریں، کشتیوں کے لیے بہت سی آبی گزرگاہیں بنی ہیں۔ مدّوجزر میں جب پانی کی سطح بلند ہوتی ہے تو وہاں کشتی سے رسائی آسان ہوتی ہے۔ ہر گزرگاہ کے کنارے مرجان کی مخروطی چٹانوں سے آج بھی ڈھکے ہوئے ہیں۔ ہر چٹان 50 ٹن سے زیادہ وزنی ہے۔

معلوم نہیں، آٹھویں سے چودھویں صدی کے درمیان یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ یہ شہر مکمل نظام تھا — حکمرانی، مذہب، رہائش، ثقافت، تدفین، یہاں سب کچھ تھا۔

رملینہ نے دلچسپی سے پوچھا: کیا اس شہر سے متعلق کوئی لوک کہانی بھی ہے؟

جین ایوز نے برجستہ کہا: بالکل۔ مقامی لوگ مانتے ہیں کہ یہ شہر دو جادوگر بھائیوں اولوسُہپا اور اولیسیپا نے بنایا۔ مشہور ہے کہ وہ آسمان سے آئے اور پتھروں کو ہوا میں اُڑا کر لائے۔ اس شہر کو "روحوں کا مقام" کہا جاتا ہے۔

پھر جین ایوز نے رملینہ کی طرف جھک کر سرگوشی کی جیسے لیکچر کے اختتام پر پروفیسر خوش اخلاقاً کہتے ہیں: لگتا ہے، تم صرف تحقیق کے لیے نہیں آئیں بلکہ تمہاری روح کسی پرانی آواز کے پیچھے آئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو سنو رملینہ!

نین مینڈول ظاہر میں ویران ہے
مگر باطن میں...
تمہیں آواز دے رہا ہے۔

رملینہ نے دھیرے سے خود سے کہا:
شاید میں وہاں جانے نہیں،
بلکہ "واپس جانے" جا رہی ہوں۔

جین ایوز ہنس پڑا۔ تیار ہو، رملینہ!
نین مینڈول تمہیں یاد رکھے گا۔
اور اس کا اگلا باب شاید
تم لکھنے والی ہو۔

ویڈیو ریکارڈنگ میں دیکھا جا سکتا تھا کہ رملینہ نے خاموشی سے AR چشمہ اتارا تو اتنے میں روبوٹ اسسٹنٹ کی نرم آواز آئی،

"سیشن مکمل ہو گیا ہے۔

آپ کے دل کی دھڑکن معمول سے سست
مگر شعور کی لہر بلند ہے۔"

ہولوگرافک روشنی تحلیل ہو جاتی ہے۔

اسکرین پر پیرس یونیورسٹی لائبریری اور
پیرس آرکیالوجی سینٹر کا logo واپس آ گیا تھا
پھر اسکرین سیاہ ہو گئی۔

ماحول میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

صوفیہ نے تبصرہ کیا: ہم نے ابھی جس دنیا کے بارے میں سنا، کیا وہ سچ میں کہیں ہے؟ پھر خود ہی بولی: رملینہ اور پروفیسر جین کے درمیان یہ مکالمہ محض علم کا تبادلہ نہ تھا بلکہ ماضی کی زمین پر حقیقت کے نقوش کی گونج تھی — ایسی صدا جو چھپے ہوئے جہانوں کے در وا کرتی ہے۔

ایشلین بھلا کہاں چپ رہتی۔ وہ پہلو بدل کر بولی: پیاری رملینہ! ہمیں یقین ہے کہ تمہارے لیے نین مینڈول کا سفر صرف تحقیق نہیں — "روحانی واپسی" کا آغاز بن گیا ہے۔

رملینہ کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ ابھری جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا — کچھ نیا اُگا تھا۔

دن ڈھل رہا تھا لیکن لیک ویو ہاؤس کی فضا میں وہ خاموشی ابھی تک جھول رہی تھی جس میں کچھ سنا گیا تھا اور کچھ اندر میں جڑ پکڑ چکا تھا۔

کیمپس کے پروفیسر کی بتائی گئی باتیں،
نین مینڈول کی ہولوگرافک حقیقتیں
اور رملینہ کے خوابوں کی مہک،
سب خیالوں کا سامان بن گیا تھا۔

دوستیں اپنی اپنی نظر سے ان باتوں کو چھان رہی تھیں۔ کوئی اسے 'میٹافزکس کی زبان' کہہ رہا تھا، کوئی 'روحانیت میں لپٹی سچائی'۔ رملینہ مسکرا رہی تھی اور درمیان میں کوئی جملہ بھی کہہ دیتی — ایسا جملہ جس کی گونج دیر تک سب کے اندر جاری رہتی۔

شام سے ذرا پہلے، سب نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا۔ تازہ سلاد، زعفرانی چائے اور گرم ولایتی روٹی کے ساتھ روحانی بیٹھک کا اختتام ہوا۔

الوداع کہنے سے پہلے رملینہ نے وعدہ کیا:
نین مینڈول کی باقی داستان بلاگ کی شکل میں
روزانہ upload کروں گی —
سب کو باری باری وہاں لے جاؤں گی،
لفظوں کی کشتی میں بٹھا کر۔

ایشلین کی گاڑی دوستوں کو لے کر لیک ویو ہاؤس سے روانہ ہوئی۔ واپسی کے سفر میں نہ وہ ہنسی تھی جو آتے وقت تھی، نہ باتیں، موسیقی اور نہ تصاویر۔ صرف خاموشی تھی—

لیکن خاموشی خالی نہیں تھی،

بھری ہوئی، مہربان خاموشی۔

جس میں ہر کوئی اندر میں گفتگو کر رہا تھا۔

سب کا اب صرف ایک شوق تھا:

نین مینڈول کی وہ پُراسرار روحانی داستان،

جس میں علم و شعور کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں اور دل کے دریچے پر ایک اور کائنات آہستہ سے دستک دیتی ہے۔

یہ محض کھنڈر کی کہانی نہیں تھی—

کیمپس کی بند ہونٹوں والی فضا کی آواز تھی جو اب جاگ اٹھی تھی۔

جب رملینہ نین مینڈول سے پیرس لوٹی تھی تو اس کے اندر کچھ ایسا تھا جو پہلے نہ تھا۔ اب وہ محض ذہین طالبہ نہ تھی بلکہ سائنس یافتہ درویشہ بن گئی تھی — جس نے جان لیا تھا کہ

بعض سوال منطق سے نہیں،

محبت اور فنا سے حل ہوتے ہیں۔

وہاں کے درویش،

فضا کی سانسیں،

شجر کی سرگوشیاں،

مخروطی پتھروں کے در و دیوار،

خاموش غار

اور چاندنی میں نہایا ہوا سمندر—

سب سے ظاہری رشتہ مٹ گیا تھا

لیکن اندرونِ جاں، ایک سلسلہ جڑ گیا تھا۔

(قسط: ۳)

ماضی کی بازگشت

مائیکرونیشیا—یونانی الفاظ Micro (چھوٹا) اور Nesos (جزیرہ) سے ماخوذ ہے۔ یہ دنیا کے سب سے بڑے سمندر بحرالکاہل (Pacific Ocean) کے مغربی حصے میں واقع بہت سے چھوٹے جزائر پر مشتمل وسیع خطہ ہے— قدرتی حسن، جغرافیائی تنوّع اور صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے کا مظہر ہے۔ جزائر باہم فاصلے پر ہیں مگر زبان اور روایات کی ڈوبتی ابھرتی لہروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ شہر نین مینڈول جو ماضی میں ساودیلور سلطنت کا روحانی اور انتظامی مرکز تھا، اس خطے میں جزیرہ پونپئی کے ساحل کے قریب واقع ہے۔

عبداللہ

قریب دور — دور قریب

◇ جھینگروں کی ایک قسم سلک پیدا کر کے اس سے اپنا گھونسلا بناتی ہے۔

◇ مشہور ہے کہ تھرمامیٹر نامی جھینگر کی گفتار کی رفتار سے درجہ حرارت معلوم کیا جاسکتا ہے۔

◇ مول جھینگر سرنگ نما بل میں پروں کو رگڑتا ہے تو بھاری اور گونج دار آواز پیدا ہوتی ہے۔

◇ دنیا کا سب سے بڑا جھینگر نیوزی لینڈ میں پایا جاتا ہے۔ جسامت زیادہ سے زیادہ چار انچ ہے۔

◇ گرم خطوں کے بعض جھینگروں کی آواز سو میٹر یا 328 فٹ دور تک سنی جاسکتی ہے۔

رات کی خاموشی نغمہ سرا ہے۔ درختوں کے سائے طویل ہو چکے ہیں، ان سایوں میں نہ جانے وقت کے کون سے راز سانس لے رہے ہیں۔ درختوں کے ساتھ زمین پر گھاس پھوس میں بھی زندگی کی ہلچل ہے — رات کے راہی خاموشی سے جاگ رہے ہیں جب کہ ان کی بیداری سے بے خبر لوگ سونے کی تیاری میں ہیں، کوئی موبائل فون میں سر دیے بیٹھا ہے، کوئی سونے سے پہلے مطالعہ کر رہا ہے اور کوئی مراقبہ میں شبِ دوستاں سجائے بیٹھا ہے۔

اتنے میں فضا میں سیٹی جیسی تیز، چبھتی ہوئی آواز گونجتی ہے اور پھر رکتی نہیں۔ ایک شخص آواز کے تجسس میں آرام دہ کمرے سے نکل کر گھر کی گلیوں میں اسے تلاش کرتا ہے، کیاری میں گملوں کے آس پاس دیکھتا ہے اور کچھ دیر گھاس کے قریب بیٹھتا ہے — مگر آواز کے ماخذ کا پتہ نہیں چلتا۔ پہلے پہل لگتا ہے کہ آواز دائیں سمت سے آرہی ہے، وہاں جانے پر بائیں سمت کا اشارہ ملتا ہے، کبھی دور اور قریب کا تاثر پیدا ہوتا ہے — آواز کے درست مقام کا پتہ نہیں چلتا۔ لگتا یہ ہے کہ کوئی فضا میں ارتعاش پھیلا کر خلا کو ناپنے کی کوشش میں ہے۔

کسی اور کا نہ سہی، میرا تجربہ یہی ہے۔

یہ جھینگر کا ذکر ہے، انگریزی میں Cricket

کہتے ہیں۔ راقم الحروف نے سردیوں کی راتوں میں جب پنکھے بند ہوتے ہیں اور خاموشی زیادہ محسوس ہوتی ہے، آواز سن کر اس کا مقام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہوا یہ کہ دیوار، گھاس، پودے وغیرہ آواز کے ہمراز بن گئے اور گونج کو ایسے پھیلایا کہ سمت ـــ سمت نہ رہی۔

ماہرینِ حیاتیات اور صوتیات کے مطابق:

◆ جھینگر کی آواز ہر سمت میں یکساں پہنچتی ہے۔ اس کے پروں کی تیز حرکت سے خارج ہونے والے دباؤ کی لہریں دائرے کی شکل میں پھیلتی ہیں اور آواز کی سمت کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔

◆ کھلی فضا میں آواز زمین، گھاس، درختوں، پتّوں، دیواروں غرض جو کچھ فضا میں موجود ہے، سے ٹکرا کر واپس آتی ہے۔ یہ بازگشت اصل آواز کے ساتھ مل کر آواز کے بیک وقت کئی سمتوں سے آنے کا تاثر دیتی ہے۔

◆ رات میں زمین کی سطح ٹھنڈی اور اس کے اوپر کی فضا نسبتاً گرم رہتی ہے۔ درجۂ حرارت کی یہ تہ بندی آواز کی لہروں کو موڑ دیتی ہے۔ نتیجے میں آواز کبھی زمین کے ساتھ پھیل کر دور تک جاتی ہے، کبھی اوپر کی طرف مڑ جاتی ہے۔ یوں درست سمت کا علم نہیں ہوتا۔

◆ محدود سماعت کے حامل کان باریک اور اونچی آوازوں کے مرکز کا تعین نہیں کر پاتے کیوں کہ ان آوازوں کی طولِ موج (ویولینتھ) بہت چھوٹی ہیں اور دونوں کانوں کے درمیان فاصلہ زاویے کی پیمائش کے لئے ناکافی ہے۔

جھینگر قدرتی اصولوں کے عجائبات سے بنا چھوٹا حشرہ ہے۔ اقسام کے لحاظ سے سائز میں فرق ہے۔ عام میدانوں میں رہنے والے جھینگر ایک یا آدھ انچ، گھروں میں پائے جانے والے زیادہ سے زیادہ 0.8 انچ اور گرم خطوں میں مقیم جھینگر کا سائز ڈیڑھ انچ تک بتایا جاتا ہے۔ یہ ان اقسام کی اوسط جسامت ہے۔

ماہرینِ حشرات کہتے ہیں کہ جھینگر کے ایک پَر پر باریک کنگھی جیسی لکیریں ہوتی ہیں جنہیں سائنسی زبان میں فائل کہتے ہیں۔ دوسرے پَر پر سخت کنارہ (اسکریپر) ہوتا ہے۔ پروں کو آپس میں رگڑنے سے کنگھی اور کنارہ ٹکراتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق آواز نکالنا نر جھینگر کا خاصّہ ہے۔ وجہ مادہ کو متوجہ کرنا اور دوسرے نر کو اپنی حدود سے دور رکھنا ہے۔

عام طور پر خاموش ماحول میں بڑی اقسام کے

جھینگروں کی آوازیں 20 یا 30 میٹر[1] دور پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں جب کہ گرم خطوں میں پائے جانے والے جھینگروں کی آواز اتنی تیز ہوتی ہے کہ 100 میٹر[2] سے زیادہ دور سنی جاسکتی ہے۔

سوال ہے کہ ایک آدھ انچ کے جھینگر اتنی تیز آواز کیسے نکالتے ہیں اور دور تک پہنچانے کا نظام کیا ہے—؟ بنیادی طور پر اس میں تین عوامل ہیں۔ خلا[3]، ارتعاش اور ڈھانچا۔

جھینگر کے پروں پر ڈھولک کی کھال کی طرح ایک پتلا اور کھوکھلا حصہ ہوتا ہے جو گونج پیدا کرنے یعنی resonator کا کام دیتا ہے اور آواز کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ جب جھینگر پروں کو تیزی سے رگڑتا ہے تو بہت زیادہ وائبریشن پیدا ہوتی ہے جو پروں میں پھیل کر آواز کی قوت کو بڑھاتی ہے۔ جھینگر کے پَر آواز پیدا کرنے کے ساتھ اسے پھیلاتے ہیں۔ وائبریشن کی ایک موج دوسری موج کو بڑھاتی ہے۔ لگتا ہے کہ آواز قریب سے دور جارہی ہے اور دور سے قریب آرہی ہے۔

ماہرینِ حشرات کے مطابق جھینگر کی آواز کی فریکوئنسی[4] ان کی جسامت اور قسم پر منحصر ہے۔ چھوٹے جھینگروں کی آواز عموماً دو سے 10 ہزار چکر فی سیکنڈ کے درمیان ہوتی ہے جب کہ بڑی اقسام کی فریکوئنسی نسبتاً کم یعنی 1500 سے چند ہزار چکر فی سیکنڈ تک محدود رہتی ہے۔ یہ اعداد و شمار اوسط ہیں اور مختلف اقسام کے لحاظ سے ان میں معمولی فرق ممکن ہے۔

دریافت شدہ اقسام میں ویٹا جھینگر کو اس نوع کا سب سے بڑا جھینگر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لمبائی زیادہ سے زیادہ چار انچ ہے۔ یہ نیوزی لینڈ میں رہتا ہے جب کہ سب سے چھوٹے جھینگر بے پَر اور لگ بھگ 0.1 سینٹی میٹر طویل ہوتے ہیں۔ یہ چیونٹیوں کے بلوں میں رہتے ہیں۔

جھینگروں میں Raspy خاندان اس لحاظ سے منفرد ہے کہ خاص قسم کا سلک پیدا کر کے اس سے اپنا گھونسلا بناتا ہے۔ منہ سے باریک ریشہ نکالتا ہے، اس کی مدد سے پتّے جوڑ کر پناہ گاہ بناتا ہے، بلوں کو مضبوط کرتا ہے اور دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے درختوں کے سوراخ محدود کر دیتا ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اس کا مسکن ہیں۔

بڑی اقسام کے ریسپی جھینگروں کے جبڑے

۱۔ 65 سے 98 فٹ ۲۔ تقریباً 328 فٹ ۳۔ resonating space۔ ۴۔ تعدّد

مضبوط ہوتے ہیں، انہیں دفاع یا شکار کو کاٹنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ تحقیق و تلاش کے مطابق یہ آواز نکالنے کے لئے ٹانگوں کو پیٹ یا پودوں کی ڈنڈیوں پر مارنے جیسے طریقے استعمال کرتے ہیں، اعلیٰ درجے کے سمت شناس ہوتے ہیں اور غذا تلاش کرنے کے بعد اپنے ٹھکانے تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ عمل وہ راستے کی طوالت کے اندازے اور بصری اشاروں سے انجام دیتے ہیں۔ ان کی ٹانگوں پر نوکیلے کانٹے ہوتے ہیں۔ ریسپی کے علاوہ دوسرے کئی جھینگر کیمیائی نشانات کے ذریعے بلوں میں واپس آتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق ان کے کان اگلی ٹانگوں کے جوڑ پر ہوتے ہیں جہاں نازک جھلّی نما حصہ لہروں کو محسوس کرتا ہے، سمت شناسی اور جواب دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔

جھینگروں کی ایک اور قسم لیف رولنگ پتّے لپیٹ کر انہیں اپنے بنائے گئے سلکی تاروں سے باندھتی ہے اور مضبوط گھر بناتی ہے۔ سلک پیدا کرنے کی صلاحیت ہر جھینگر میں نہیں ہے۔

بعض اقسام کی پچھلی ٹانگیں کھدائی کے لیے موزوں ہیں جب کہ سامنے کی ٹانگوں کے کانٹے شکار پکڑنے میں مدد دیتے ہیں۔

ان کی ایک منفرد قسم Snowy Tree ہے جسے Thermometer Cricket بھی کہا جاتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ان کی گفتار کی رفتار سے موسم کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ درجہ حرارت کے لحاظ سے تال بدلتے ہیں۔

1897ء میں محقق ایموس ڈول بیئر نے کہا کہ گرم موسم میں جھینگر تیزی سے آوازیں نکالتا ہے اور سرد موسم میں رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اس نے قانون پیش کیا کہ 14 سیکنڈ میں جھینگر کی آواز میں مدّوجزر کی تعداد گنیں اور اس میں 40 کا اضافہ کر دیں تو حاصل شدہ عدد تقریباً اس وقت کے درجہ حرارت کے برابر ہوگا (فارن ہائیٹ میں)۔ مثلاً اگر جھینگر 14 سیکنڈ میں 30 بار آواز نکالے تو درجہ حرارت تقریباً 70 ڈگری فارن ہائیٹ یا 21 ڈگری سینٹی گریڈ ہوگا۔

یہ جھینگر سرد علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے جسم میں اینٹی فریز جیسا مادہ ہوتا ہے جو خون کو جمنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ سردی میں بہت سست جب کہ خزاں کی ابتدا اور گرمیوں میں زیادہ فعال ہوتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مادہ سمیت ہر جھینگر تیز اور اونچی آواز نہیں نکالتا۔ کچھ خاموش رہتے ہیں جیسے ریسپی جھینگر جو دفاع یا حرکت کے وقت ہلکی آواز نکالتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ شور فیلڈ جھینگر کرتے ہیں۔ اسی طرح بش جھینگر کی آواز تیز اور مختلف تال میں ہوتی ہے۔ ایک قسم خاموشی سے غاروں میں رہتی ہے۔

مول نامی جھینگر زمین کے اندر سے بھاری آواز نکالتے ہیں۔ دنیا کے گرم اور نم علاقوں میں پائے جاتے ہیں جیسے پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا، افریقا، یورپ اور امریکا۔ یہ کھیت، باغات اور نم مٹی میں زمین کے اندر رہتے ہیں۔ اگلے پیروں کی مدد سے جو بیلچے کی طرح چوڑے اور مضبوط ہوتے ہیں، سرنگیں کھودتے ہیں۔ یہ کھیت اور باغات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

مول جھینگر اپنے بل کے اندر سرنگیں بناتا ہے۔ جب پروں کو رگڑتا ہے تو سرنگ میں خلا کی وجہ سے بھاری اور گونج دار آواز پیدا ہوتی ہے۔ آواز مٹی سے باہر آتی ہے تو مدہم ہو جاتی ہے۔ اس کی بھاری اور ہلکی آواز کا فرق جگہ اور سننے کے زاویے کی وجہ سے ہے۔

کچھ جھینگر پروٹین پر مبنی مادے سے سلک بناتے ہیں۔ سلک کی ساخت beta-sheet کی ترتیب میں ہوتی ہے۔ بیٹا شیٹ میں پروٹین کی زنجیریں کپڑے کے دھاگوں کی طرح بُنی جاتی ہیں۔ جھینگر اس سے مضبوط ریشے (فائبر) بناتے ہیں اور ان سے پتلی جھلّیاں (films) تیار کرتے ہیں جو اشیا کو جوڑنے کا کام دیتی ہیں۔ یہ پروٹین امینو ایسڈ سے مل کر بنتا ہے۔ امینو ایسڈ طویل زنجیر میں جڑتے ہیں تو سیدھے نہیں رہتے بلکہ مڑ کر مخصوص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

جھینگر چھوٹا حشرہ ہے لیکن تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کے لئے رصد گاہ ہے۔ اس کے اندر طبیعیات، سماجیات، صوتیات، موسمیات اور کیمیا وغیرہ کے نظام ہیں۔ قدرت نے اس ننھے وجود میں آواز، توانائی اور علم کے متعدد شعبوں کو سمیٹ دیا ہے۔ سردیوں کی راتوں میں جب جھینگر کی صدا گونجے تو اسے شور نہیں سمجھئے بلکہ اس کی آواز میں نظامِ زندگی کے قوانین تلاش کیجئے۔

Manufacturer of
Embroided Lace & Fabrics

PRIME LACE INDUSTRIES
(PVT.) LTD.

C-8, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880107 Fax: 022-3880381

عابد محمود

دریا میں کشتیاں ــــ؟

لگتا یہ ہے کہ ہم صرف ایک لمحہ جیتے ہیں، وہ لمحہ جس میں شعور مناظر کو ٹھوس دکھاتا ہے، باقی لمحے یاد بن جاتے ہیں۔

زہیر کا چلتا ہوا کام رک گیا، آمدنی کم ہوگئی اور حالات مشکل ہوگئے۔ تنگدستی میں وسوسوں نے گھیر لیا اور پریشانی کے دَور نے وقت کو محسوس کرنے کی رفتار کو سست کر دیا۔ راتیں کروٹیں لیتے گزرتیں اور خاموشی میں گھڑی کی ٹک ٹک کانوں میں ہتھوڑے کی مانند گونجتی۔

آج بھی وہ گہری فکر میں گم، جاگ رہا تھا۔

رات کے تین بج گئے تھے۔

ماں نے بیٹے کے کمرے میں روشنی دیکھی تو اس کے پاس گئی اور بیٹے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، تیرے پاس دو راستے ہیں۔ پریشان خیالی میں راتیں جاگ کر گزار دے، یہ کاروبار میں نقصان سے بڑا نقصان ہے یا دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ سے مدد مانگ اور اللہ کے بھروسے پر دکان میں بیٹھ۔ اللہ تیرا رزق تجھ تک پہنچا دے گا۔ جو تجھے ملے، اس میں سے اللہ کی مخلوق کا حصہ ضرور رکھنا۔

وہ تھک گیا تھا— سہارا چاہئے تھا۔ ماں کی بات سے وجود ہلکا ہوگیا۔ ماں نے کمرے سے نکلتے ہوئے بتی بند کر دی۔ زہیر جس کے سر پر کچھ دیر پہلے منوں بوجھ تھا، ماں کے الفاظ کی چھاؤں میں آکر سوچ رہا تھا کہ پریشانی کا بوجھ کیسے ہَوا ہوگیا اور گھڑی کی ٹک ٹک میں برسوں جیسی طوالت کا احساس کہاں چلا گیا؟

ماں کے حکم کی تعمیل کی۔

زہیر پیشے کے لحاظ سے درزی تھا۔ زندگی صبح سے رات تک سوئی اور دھاگے کی یکجائی اور سلائی مشینوں کی ہم نوائی میں گزرتی تھی۔ اس نے ثابت قدمی سے ہر صبح وقت پر دکان کھولی

اور اللہ کے بھروسے پر گاڑی چلنے لگی۔ اللہ نے فضل فرمایا اور دکان پر گاہکوں کی قطار لگ گئی۔ ایک آتا، ایک جاتا تھا۔ مشینیں وقفے وقفے سے چلتی اور رکتی تھیں، کبھی قینچی کی آواز کانوں میں گونجتی، کوئی دھاگے کی اُدھیڑ بُن اور تُرپائی میں مشغول ہوتا، کسی میز سے استری کی بھاپ اٹھتی، ان سب آوازوں کے ساتھ گاہکوں کی آواز سے دکان ہستی بستی رہتی تھی۔

آج معمول سے زیادہ مصروف دن تھا۔ زہیر کو رات ہونے کا احساس نہیں ہوا۔ ساتھ کام کرنے والے لڑکے نے بتایا کہ دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ گھڑی دیکھی تو بڑی سوئی 12 اور چھوٹی نو (9) پر تھی۔ یاد آیا کہ آج گھر جانے سے پہلے بابا نورالدین کے پاس حاضر ہونا تھا۔ آٹھ بجے دکان بند کر دینی چاہئے تھی۔ تیزی سے سامان سمیٹ کر دکان کا شٹر گراتے ہوئے سوچا کہ صبح سے رات تک کا وقت کہاں گیا!

راستے میں آسمان پر روشن چاند دیکھ کر دوبارہ دستک ہوئی کہ وقت گزر رہا ہے یا ہم وقت کے اندر سفر کر رہے ہیں؟ جواب کی تلاش میں گم بابا نورالدین کی خانقاہ میں داخل ہوا تو چونک گیا کہ دکان سے یہاں آنے میں ایک بار پھر وقت کا احساس نہیں ہوا۔

خانقاہ کے احاطے میں کوئی مراقب تھا۔

چہرے پر اطمینان کی روشنی تھی۔

وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

دھیمی آواز گونجی، کیسے آنا ہوا؟

بابا جی، بہت دن ہوئے سلام کے لیے حاضر نہیں ہوا تھا، پتہ نہیں وقت کہاں جا رہا ہے اور کہاں سے آ رہا ہے۔ کبھی طویل ہو جاتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ میں وقت کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت گزرتا ہے مگر کبھی کبھی لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ کیسا راز ہے؟

بابا مسکرائے۔ بیٹا، وقت نہیں بدلتا — اس کو نہ سمجھنے والے کا ذہن بدلتا رہتا ہے۔ تم نے دریا دیکھا ہے، یہ ہر مقام پر دریا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ دریا بہ رہا ہے۔ ہم وقت کے دریا میں کشتیاں ہیں۔ جب خوش ہوتے ہیں تو دریا کا بہاؤ اپنا سفر لگتا ہے اور جب غمگین ہوتے ہیں تو کشتی بھاری ہو کر دریا کی روانی سے پیچھے رہ جاتی ہے اور وقت طویل محسوس ہوتا ہے۔

دریا کی تمثیل نے نگاہوں کے سامنے منظر بنادیا۔ اس نے پوچھا، باباجی — وقت کیا ہے اور میں کون ہوں؟ ایک وقت تھا کہ میں دو سال کا بچہ تھا اور آج 35 سال کا جوان ہوں۔ دو سال گزر گئے تو 35 واں سال بھی گزر جائے گا۔ میں وہ ہوں اور نہ یہ، اس کے بعد جو آئے گا، میں وہ بھی نہیں — پھر میں کون ہوں؟

بابا نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، یہ وقت کے دھارے میں بہنے کے لیے آدمی کی شعور کو قائم رکھنے کی ترتیب ہے وگرنہ یہاں حال ہے نہ مستقبل، سب ماضی ہے۔

زہیر نے الجھے ہوئے لہجے میں دہرایا۔

سب ماضی ہے؟

بابا نے کہا، سب ماضی کے دریچے ہیں۔ جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو کہاں آتا ہے؟ ماضی میں آتا ہے۔ ہر شے ماضی سے جڑی ہوئی ہے۔ پہاڑ، دریا، فضا، ہمارے والدین، بچے اور ہم ماضی کے نقوش ہیں لیکن دیر سے واقف ہونے کی وجہ سے ان کو حال سمجھتے ہیں۔

باباجی نے فرش پر لکیر کھینچی۔

یہ لکیر سیریل ٹائم ہے۔ اس میں صبح، دوپہر، شام، رات — پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور موت — لمحہ، منٹ، گھنٹہ، دن، مہینہ سال، سب ترتیب سے رہتا ہے۔ سمجھ لو، یہ دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک ہے۔

زہیر کو وہ دن یاد آگئے جب دکان پر گاہکوں کی آمد رک گئی تھی اور خوف وغم کی راتوں میں گھڑی کی ٹک ٹک ٹک سال برابر طویل لگتی تھی لیکن وہ وقت بھی گزر گیا۔

باباجی، کیا اسی کو وقت کہتے ہیں؟

فرمایا، یہ وقت کا ایک مظاہرہ ہے اور زندگی اس کے پردے میں ہے۔ پردے کے پیچھے گھڑی کی ٹک ٹک نہیں ہے، وہاں ایک لمحہ ہر لمحے کے اندر دَور کرتا ہے اور سب کو یکجا رکھتا ہے۔

پھر انہوں نے فرش پر دائرہ بنایا۔

یہ نان سیریل ٹائم ہے۔ ترتیب اس میں بھی ہے لیکن طوالت کا احساس حذف ہو جاتا ہے۔ جیسے روشنی کے اندر تمام رنگ مخفی ہوتے ہیں، اسی طرح نان سیریل ٹائم میں زندگی کی ساری قدریں ہم جان ہیں۔

زہیر نے کہا، لگتا یہ ہے کہ ہم صرف ایک لمحہ جیتے ہیں، وہ لمحہ جس میں شعور مناظر کو ٹھوس

دکھاتا ہے، باقی لمحے یاد بن جاتے ہیں۔

بابا نورالدین نے پوچھا، تم وہ لمحہ کس بنیاد پر جیتے ہو؟ اگر گزرے ہوئے لمحے سہارا فراہم نہ کریں تو اگلا لمحہ ظاہر نہیں ہوتا۔ تم ایک لمحے میں سارے لمحے جی رہے ہو۔

زہیر کے اندر کوئی کھڑکی کھلی جس کے پار دیکھنے کا تجسس بڑھ گیا۔ کیا میں ماضی کو اِس لمحے میں محسوس کرسکتا ہوں؟

بابا جی نے آنکھیں بند کرکے کہا، بالکل! مگر پہلے خاموش ہو جاؤ۔ فرضی شعور کے خمار سے آزاد ہو جاؤ۔ کان اور آنکھ کو اندر میں مشغول کر دو پھر سنو، دیکھو اور سمجھو۔

آنکھیں بند کیں تو بچپن کا منظر سامنے تھا۔ اماں کی گود، ابو کا کندھا، دادی کے حلوے کی خوش بو، بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنا۔ پھر منظر بدلا، وہ جوان تھا — اسپیس کی اٹھان تھی اور خواب تھے۔ اس نے غیر محسوس وقت میں، بچپن سے جوانی تک گزری ہوئی زندگی کی فلم دیکھی۔ درمیان سے برسوں کا فرق مٹ گیا۔

بابا نورالدین کی آواز آئی، وقت میں فاصلے نہیں ہیں جب کہ ہم صرف فاصلے دیکھ رہے ہیں۔ جب یہ فاصلے سمٹیں گے، وقت کا ادراک ہو جائے گا۔

بابا، لگتا ہے کہ میں آپ کے پاس دیر سے آیا ہوں، سوال کے جواب پہلے مل جاتے تو اتنے برس پریشانی میں نہ گزرتے۔

انہوں نے کہا، تم وقت پر آئے ہو، آج سے پہلے آتے تو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ حال اور مستقبل، ماضی کی اطلاع کا بہاؤ ہے۔ جب تمہارا شعور ان کو قبول کرتا ہے تو یہ منظر بن جاتے ہیں اور جب تم ان سے نظر ہٹاتے ہو تو مناظر پردے میں چلے جاتے ہیں۔ تم اطلاع وصول کر رہے ہو، اور تمہیں لگتا ہے کہ منظر بدل رہا ہے۔ سنو! آنے جانے والے مناظر ہم سے کہتے ہیں کہ پہاڑ اور دریا سمیت یہاں کوئی چیز جامد نہیں ہے، سب ماضی سے تعارف کے لیے اطلاع کا بہاؤ ہیں۔ اگر تم وقت سے واقف ہونا چاہتے ہو تو وقت کی قدر کرو۔ یہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔

زہیر نے دل پر ہاتھ رکھ کر بابا نورالدین کو ادب سے سلام کیا اور گھر کی راہ لی۔ ”وقت کی قدر“ کے الفاظ کی گونج سفر میں ساتھ تھی۔

اشرف صبوحی

بارہ مسالے کی چاٹ

آج تک دلّی کے قدیم گھرانوں میں مرچیں زیادہ کھائی جاتی ہیں۔ چوں کہ مرچوں کا دف گھی سے مرتا ہے اس لیے جب تک گھی خالص اور سستا رہا، مسالے دار کھانوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔

زندگی نام ہے زندہ دلی کا۔

زندہ دلی نہیں تو زندگی کے کیا معنی؟

ہماری نئی نسل کا دعویٰ ہے کہ وہ جمود کا زمانہ تھا، یہ حرکت کی دنیا ہے۔ وہ تنزل کی آخری منزل تھی، اب ترقی کا دور ہے۔ جو چاہے، کہیں لیکن ہم تو یہی کہیں گے اور برابر کہے جائیں گے کہ ہمیں ہنسوں کی چال راس نہیں۔ گرم ملک میں ٹھنڈی ہواؤں سے لقوہ مار جاتا ہے۔ پرائے شگون میں ناک بغیر کٹے کیا مجال ہے کہ رہے۔

قلعہ اجڑنے اور بہادر شاہی ٹینٹ اکھڑ جانے کے بعد آج سے پینتیس چالیس برس پہلے تک جیسے خوش حال دلّی والے جیتے تھے، آج نہیں جی سکتے۔ شادی بیاہ اور مرنے جینے کے سوا اتنی فضول خرچیاں اور فیشن پرستیاں نہ تھیں۔ پھر اپنے ملک کی دولت اپنے بھائیوں کی کمائی اپنے گھروں میں رہتی تھی۔ صرف روپیہ مہنگا تھا اور ہر چیز سستی۔ ایک روپے کے بتیس ٹکے اور ایک ٹکے کی ایک سو ساٹھ کوڑیاں، دو کوڑی کا دام اور چار گنڈے کا چھدام[1]۔ دام اور چھدام میں نون[2] مرچ، ساگ پات خریدا جاسکتا تھا۔ کُرّ[3] مکینوں کی عموماً تنخواہیں نہ تھیں۔ شادی بیاہ اور تہواروں کی آس میں خدمتیں کرتے اور اسی میں مگن رہتے تھے۔ آج روپیہ جتنا سستا ہے، اتنی ہی زندگی گراں ہے۔

شہر اجلا ضرور ہوا ہے۔ بازار بجلی کے ہنڈوں[4] سے جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں مگر پہلے جیسی بات نہیں۔ اجناس ہیں تو اجنبی، بولیاں ہیں تو بیسنی، مخلوق ہے تو بچ رنگی اور لباس دیکھو تو

۱۔ چھدام، ایک پرانا سکّہ، روپے کا پانچواں حصہ ۲۔ نمک ۳۔ مزدور ۴۔ کھمبوں پر جلنے والے بلب

بھان متی کا تماشا۔ یہ دلّی ہماری دلّی تو رہی نہیں، خاصا تھیٹر ہے۔ جب سے اس بوڑھی گھوڑی کو لال لگام کا شوق ہوا 'ماں ٹینی باپ کلنگ بچے نکلے رنگ برنگ' والی مثل صادق آگئی۔ ٹھیٹ مذاق نہ رہا۔ پہننے اوڑھنے کے ساتھ کھانے پینے کی ترکیبوں میں بھی فرق آ گیا۔ شہر میں چپے چپے پر یہ ہوٹل کہاں تھے۔ بازاروں میں بیٹھ کر یوں کھلم کھلا کون کھاتا تھا؟ گلیوں میں بھٹیاروں کی دکانیں تھیں یا نان بائی تھے یا شہر کے خاندانی باورچی جو شادی اور غمی کی پخت (کھانا پکاتے) کرتے تھے۔ بھٹیارے غریبوں، مزدوروں اور کم استطاعت مسافروں کا دو تین پیسے میں پیٹ بھر دیتے تھے۔ نان بائیوں کے ہاں شیر مال، کلچے، باقرخانی اور خمیری روٹیاں پکتی تھیں لیکن ان کا کام تیس دن کا نہ تھا اس لیے جاڑے بھر یہ نہاری کی دکان بھی لگاتے تھے۔

نہاری کیا تھی، بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی تھی۔ امیر سے امیر اور غریب سے غریب اس کا عاشق تھا۔ نہاری اب بھی ہوتی ہے مگر اس کی تیاری کا سلیقہ نہیں۔ ہر بھٹیارا نہاری پکانے لگا، ہر نان بائی نہاری والا بن بیٹھا مگر نہ وہ ترکیب یاد ہے نہ ہاتھ میں وہ لذت۔ کھانے والے نہ رہیں تو پکانے والے کہاں سے آئیں۔

سنا ہے کہ جب سعادت خاں نے جمنا کی شاہجہانی نہر کو جو جا بجا سے اَٹ کر خشک ہو چکی تھی، دوبارہ شہر میں جاری کیا تو علوی خان حکیم نے ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ محمد شاہ نے اِس غم و افسوس کا سبب دریافت کیا تو کہا، مجھے دلّی والوں کی تندرستی کا رونا ہے۔ اب یہ بیماریوں کا گھر ہو جائے گا۔ علاج پوچھا تو بتایا کہ لال مرچیں اور کھٹائی کا استعمال زیادہ کیا جائے تو شاید بچ جائیں۔ چناں چہ ہر گھر میں مرچوں کی بھرمار ہوگئی اور آج تک دلّی کے قدیم گھرانوں میں مرچیں زیادہ کھائی جاتی ہیں۔ چوں کہ مرچوں کا دف (تیزی) گھی سے مرتا ہے اس لیے جب تک گھی خالص اور سستا رہا، مسالے دار کھانوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔

نہاری کا نام سن کر باہر والے خوش ہو جاتے ہیں، ملنے والوں سے نہاری کی فرمائش ہوتی ہے۔ اگر میزبان سلیقہ مند ہے تو خیر ورنہ کھانے والوں کو منہ پیٹنا پڑتا ہے۔ چار آنے کی نہاری میں آٹھ آنے کا گھی کون ڈالے۔ پھر آج کل والے یہ

بھی نہیں جانتے کہ نہاری کے بعد ترتراتے حلوے یا گاجر کی تری سے مسالوں کی گرمی کو مارا جاتا ہے اس لیے نہاری بدنام ہوگئی ہے۔

اس کے سوا نہاری بیچنے والوں کو بھی تمیز نہیں رہی۔ ایرے غیرے نتھو خیرے نہاری کی دکانیں لے بیٹھے ہیں۔ پہلے گنتی کے نہاری والے تھے۔ ان میں سے ہر ایک شہر کا ایک ایک کونا دبائے ہوئے تھا— سب سے زیادہ مشہور گنجے نہاری والے کی دکان تھی۔ جب تک یہ زندہ رہا، نہاری اصلی معنوں میں نہاری رہی۔ یہ کیا گیا کہ نہاری کا مزہ مرگیا۔ اب نہاری کیا کھاتے ہیں— کلیجہ جلاتے ہیں۔

یہ دکان ہم نے دیکھی ہے، وہاں جاکر نہاری بھی کھائی ہے۔ شوقین دور دور سے پہنچتے تھے۔ گرم گرم روٹی اور دیگ سے نکلی ہوئی نہاری، جتنی نلیاں چاہیں، جھڑوائیں۔ بھیجہ ڈلوایا۔ پیاز سے کڑکڑاتا ہوا گھی، بوم کی بے ریشہ بوٹیاں۔ ادرک کا لچھا۔ کُتری ہوئی ہری مرچوں کی ہوائی اور کھٹے کی پھٹکار۔ گھروں میں اِس سامان کے لیے پورے اہتمام کی ضرورت ہے اس لیے جو اصل میں نہاری کا لُطف اٹھانا چاہتے تھے، انہیں دکان پر جانا پڑتا تھا۔

گنجے نہاری والے کی آن کا کیا کہنا۔ سنا ہے کہ چُھنّامل والے دہلی کے رئیسِ اعظم اس کی دکان خریدنا چاہتے تھے۔ ہزار کوششیں کیں۔ روپے کا لالچ دیا، جائیداد کی قیمت دگنی اور چوگنی لگادی یہاں تک کہ دکان میں اشرفیاں بچھادینے کو کہا۔ دوسرا ہوتا تو آنکھیں بند کرلیتا لیکن یہ نہاری والے مرتے دم تک آن سے وہیں بیٹھے رہے۔

ہم پانچ چار دوست پیٹ بھر کر نہاری کے شوقین تھے۔ جاڑا آیا اور نہاری کا پروگرام بنا۔ یوں تو اتوار کے اتوار باری باری سے کسی نہ کسی کے گھر پر نہاری اڑا کرتی تھی لیکن ہر پندرہویں دن اور اگر کوئی باہر کا مہمان آگیا تو اس معمول کے علاوہ بھی خاص دکان پر جاکر ضرور کھالیا کرتے تھے۔ ہمارا دستور تھا۔ ہم پر کیا منحصر ہے نہاری بازوں کے یہ بندھے ہوئے قاعدے ہیں کہ صبح کے لیے رات سے تیاری ہوتی تھی۔ تازہ خالص گھی دو چھٹانک فی کس کے حساب سے مہیا کیا جاتا تھا۔ گاجر کا حلوا حبش خاں کے پھاٹک یا جمال الدین عطار سے لیتے تھے۔ اور تو کیا کہوں، اب ویسا حلوا بھی کھانے میں نہیں آتا۔ گندے نالے کی پھکسی ہوئی نیلی سفید، پھیکی

سیٹھی[۵]، کچی یا اتری ہوئی گاجروں کی گلٹھی[۶] ہوتی ہے۔ اب اور کیا تعریف کروں۔

خیر! صبح ہوئی، مؤذن نے اذان دی اور نہاری نے پیٹ میں گدگدیاں کیں۔ ہمارے دوستوں میں خدا بخشے ایک دوست بڑے زندہ دل، یاروں کے یار اور نہایت خدمتی تھے۔ ان کی ڈیوٹی تھی کہ اندھیرے سے اٹھ کر ایک ایک دوست کے دروازے کی کنڈی پیٹیں، کوسنے سنیں اور ایک جگہ سب کو جمع کر دیں۔ جب تک ہماری یہ ٹولی زندہ سلامت رہی اور نہاری والے صاحب آلتی پالتی مارے، چمچہ لیے دیگ کے سامنے گدّی پر دکھائی دیتے رہے، نہ ہمارا یہ معمول ٹوٹا اور نہ نہاری کی چاٹ چھوٹی۔ دو چار مرتبہ کی تو کہتا نہیں ورنہ عموماً ہم اتنے سویرے پہنچ جاتے تھے کہ گاہک تو گاہک، دکان بھی پوری طرح نہیں جمنے پاتی تھی۔ کئی دفعہ تنور ہمارے پہنچنے پر گرم ہونا شروع ہوا اور دیگ میں پہلا چمچہ ہمارے لیے پڑا۔ دکان کے سارے آدمی ہمیں جان گئے تھے۔ تین چار موقعوں پر مالک نے خصوصیت کے ساتھ ہمارے باہر والے احباب کی دعوت بھی کی اور یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ جب علی گڑھ یا حیدرآباد کے کوئی صاحب ہمارے ساتھ ہوتے، وہ معمول سے زیادہ خاطر کرتا۔ فرمائش کے علاوہ نلی کا گودا، بھیجا اور اچھی اچھی بوٹیاں بھیجتا رہتا اور باوجود اصرار کے، کبھی ان چیزوں کی قیمت نہ لیتا۔ اب یہ اپنے شہر والوں کی پاس داری کہاں—؟ ہماری وضع میں کیا سلوٹیں آئیں کہ زندگی کی شرافت ہی میں جھول پڑ گئے۔

گنجے نہاری والے باتیں بڑے مزے کی کرتے تھے۔ مجھ کو پرانے آدمیوں سے پرانی باتیں سننے کا بچپن سے شوق ہے۔ جب تک دکان لگتی، گاہک آتے، میں ان کا دماغ چاٹا کرتا۔

ایک دفعہ سترہویں کے لیے چند دوست باہر سے آگئے اور آتے ہی فرمائش کی کہ نہاری نہیں کھلواتے؟ میں نے کہا، نہاری کل صبح سہی، وہیں سے درگاہ نظام الدینؒ چلے چلیں گے۔

سویرے دکان پر جا پہنچے۔ دیگ ابھی کھلی نہ تھی، تنور گرم ہو رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی گنجے صاحب کہنے لگے، حضرت! پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ ذرا تنور کا تاؤ آجائے مگر آج یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں، پنجاب کے معلوم

۵۔ بے رس، بے مزہ ۶۔ گلنے سڑنے کا اثر، لئی کی طرح چپکی ہوئی

ہوتے ہیں۔ سترہویں میں آئے ہوں گے؟ ہم نے کہا، ہاں! خاص لاہور کے رہنے والے ہیں۔ سوچا، کیا یاد کریں گے، نہاری کھلا دو۔ وہ بولے، مگر میاں، نہاری میں تو مرچیں زیادہ ہوں گی۔

ہم نے پوچھا، کیا کوئی صورت ایسی نہیں کہ مرچوں کی جھونجھ کم ہو جائے؟

انہوں نے کہا، کھٹے اور گھی کے سوا اور کیا علاج ہے لیکن میاں! کھانے کا مزہ جاتا رہے گا۔ ہر چیز قاعدے سر کی ہونی چاہئے۔ خیر، اللہ مالک ہے، کھلاؤ تو سہی۔ ہم نے کہا، منہ نہ پٹوا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ نیکی برباد، گناہ لازم ہو جائے۔ کہنے لگے، اپنی طرف سے تو کمی کروں گا نہیں پھر بھی ناک آنکھ بہنے لگے تو اِن کی تقدیر۔

ہم نے پوچھا، تم بھی سترہویں میں جاؤ گے؟

جنگِ آزادی (1857ء) سے پہلے سترہویں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بولے، عقیدت کا میلا ہوتا تھا۔ محبوبِ الٰہی (خواجہ نظام الدین اولیاؒ) کی اولیائی کو پہچاننے والے سر کے بل جاتے تھے اور میاں، آنکھوں والے آج بھی سر کے بل جاتے ہیں۔

ہم نے اس سے کہا، تم نے تو بادشاہی کے دور کی سترہویں بھی دیکھی ہے۔ آخر ہم بھی سنیں کہ اس وقت اس میلے کا کیا رنگ تھا؟

نہاری والے نے کہا، پچاس پچپن برس کی باتیں ہیں۔ پوری پوری کہاں یاد۔ اپنے ہوش میں جنگِ آزادی سے پہلے کی ایک سترہویں میں نے دیکھی تھی، کچھ آنکھوں دیکھے اور کچھ کانوں سنے حالات ملا کر سناتا ہوں۔

سب سے پہلے درگاہ میں مشائخ جمع ہوتے تھے۔ سترہویں کی رات شہر کے عقیدت مند پہنچ گئے۔ اوّل ختم ہوا، رات کا وقت، قندیلیں روشن، اللہ والوں کا مجمع، برکات کی بارش، وہ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ کالے سے کالے دل نور سے بھر جاتے تھے۔ پھر قوالی شروع ہوئی۔ صاف ستھرے اہلِ دل قوالوں کی ٹولیاں، درد بھری آوازیں، اللہ ہو کے زمزمے، فارسی اردو زبان کا کلام جس سے پتھر موم ہو جائے۔ آدمی کا کیا بُوتا (تاب) ہے کہ چپ بیٹھا رہے۔ جسے دیکھو لوٹن کبوتر۔ رات بھر 'ہو حق' رہی۔

صبح کو بادشاہ آئے۔ سر جھکائے ہوئے مؤدب دست بستہ، پیچھے پیچھے امیر، وزیر، شہزادے نیچی نگاہیں۔ خاموش۔ درگاہ میں فاتحہ پڑھی۔

چار اشرفیاں اور بتیس روپے نذر چڑھائی۔ دو سو روپے عرس کی نیت کے خادموں کو دیے، ختم میں شرکت کی۔ اتنے میں خادم تبرک کی ہنڈیاں اور پھیٹنے لائے۔ بادشاہ نے سر جھکا کر پھیٹنا[7] بندھوایا، ہنڈیاں چوب دار نے سنبھالیں اور ایک اشرفی تبرک کی دے کر سوار ہو گئے۔

اب شہر کی خلقت آنے لگی۔ قوالی زوروں پر ہے، درگاہ میں نذریں چڑھ رہی ہیں۔ جس کو دیکھو، ہاتھوں میں لیے دو دو تبرک کی ہنڈیاں کھِلیں، بتاشوں، شکر پاروں سے بھری آٹے سے منہ لپا ہوا۔ دوہتہ کے سبز اور سفید پھیٹنے سر پر لپیٹے جاتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سلطان جیؒ کے دربار سے خلعت اور انعام مل رہا ہے۔

پھر اس نے ہم سے کہا، اچھا، اب آپ اوپر تشریف لے جایئے۔ آپ کے لائق روٹیاں اتر آئی ہیں۔ گھی کڑکڑا رہا ہوں۔ نہاری بگھری اور میں نے کھانا بھیجا — بسم اللہ۔

یہ حقیقت ہے کہ اِس زمانے میں اگلی سی فارغ البالیاں[8] نہیں رہیں۔ نہ دلوں میں امنگیں ہیں نہ جذبات میں زندگی۔ پرانے لوگ پرانی باتوں کو جتنا روئیں، بجا ہے کہ انہوں نے اپنی بادشاہت، اپنی حکومت اور اپنا گھر آباد دیکھا تھا۔ عید، بقر عید، شبِ برأت، محرم، سترہویں آج بھی ہوتی ہے۔ کہیں کہیں بسنتیں اور کبھی کبھی پھول والوں کی سیر بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق و ہوس کا سا تفاوت[9] ہے۔

؎ کیا پوچھتا ہے ہم دم، کل کیا تھا، آج کیا ہے
محفل اجڑ گئی ہے --- افسانہ رہ گیا ہے

سردیوں کی غذا

روایت ہے کہ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں دہلی میں انفلوئنزا کی وبا پھیل گئی۔ شاہی خاندان اور عام لوگ سب متاثر ہوئے۔ نزلہ، زکام اور بخار کے توڑ کے لیے شاہ جہاں کے حکم پر شاہی حکیموں نے رات بھر ہلکی آنچ پر خالص سالن تیار کیا جسے نہاری کہا گیا۔ نام عربی لفظ 'نہار' سے آیا ہے اور یہ صبح کے کھانے کے لیے مخصوص تھا۔ عوام و خواص جاڑے کی صبح ناشتے میں اسے کھاتے تھے — اس لیے اسے 'نہاری' یعنی 'صبح کا کھانا' کہا گیا۔

۷۔ پگڑی ۸۔ خوش رہنا، پریشانی سے آزادی ۹۔ فرق

مینا ہے جہاں وہیں قیام اپنا ہے

خالقِ کائنات اللہ نے کُن فرما کر کائنات کو ظاہر کیا۔ علمائے باطن فرماتے ہیں کہ کُن کے بعد مخلوق کو محض اتنا ادراک تھا کہ میں ہوں لیکن میں کیا ہوں، کس نوع کا فرد ہوں، میری انفرادیت کیا ہے، میری تخلیق کیوں ہوئی اور میرا خالق کون ہے، اس کا علم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تعارف کے لئے مخلوقات کو محویت سے نکالا اور فرمایا،

"کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟"

آواز سن کر مخلوقات میں حواس منتقل ہوئے۔ آواز کی سمت رجوع کیا اور ربِ کائنات کا دیدار اور اقرار کیا کہ بلاشبہ،

"آپ ہی ہمارے رب ہیں۔"

یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ کائنات میں ہر فرد کا پہلا، واحد اور براہِ راست رشتہ اپنے خالق اللہ سے ہے۔ اس مقام پر مخلوق میں نہ کوئی ماں ہے نہ باپ اور نہ اولاد ہے، نہ قبیلہ، برادری، ذات پات، قوم یا ملک کا کوئی وجود ہے۔ یہی ہر فرد کی اصل فطرت ہے کہ اس کا واحد حقیقی، اول و آخر رشتہ اپنے خالق سے ہے۔ بچہ اسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے کہ اللہ خالق اور وسائل مہیا کرنے والی ذات ہے اور میں اللہ کی مخلوق ہوں۔ دنیاوی رشتے معاشرتی نظام کی ضرورت ہیں جو دنیا میں آنے کے بعد کا مرحلہ ہے۔

بچے کا اصل شعور، اِس دنیا میں پہلے دن سے، محدود شعور کے بے شمار پردوں میں گم ہوتا جاتا ہے۔

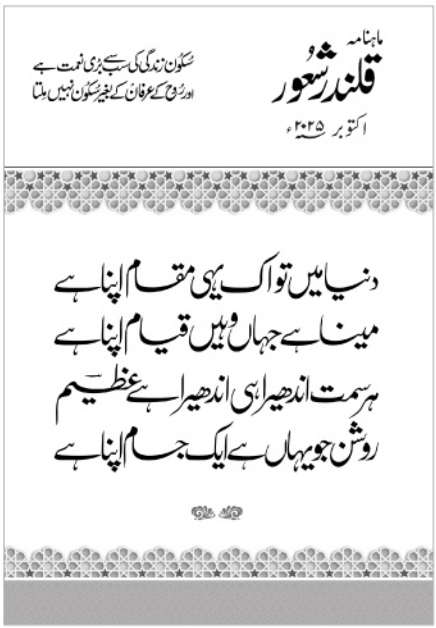

وہ فریب کے شعور کو مسلط کر لیتا ہے اور اس سے الگ ہو کر اپنی اصل تلاش کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ نوعِ آدم کی اصل "احسنِ تقویم" ہے یعنی وہ خالقِ کائنات کی بہترین صنّاعی ہے اور خالق کے عطا کئے گئے علم الاسماء کی بدولت زمین پر اللہ کا نائب ہے۔

دنیاوی شعور، فریب کا شعور ہے، تقسیم در تقسیم بے شمار ٹکڑوں میں بکھرنا اس کی خاصیت ہے۔ گھر اور معاشرے کے رنگ دیکھ کر بچہ پہلے خاندان پھر قبیلے، برادری، قوم یا رنگ کی تخصیص سے اپنا تعارف کرواتا ہے۔ یہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ وہ اپنی نوع کے دوسرے افراد کو خود سے کمتر قرار دے دیتا ہے اور حق تلفی کرتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق، برتری کی واحد صورت "تقویٰ" ہے کہ فرد کو غیب کا کس قدر مشاہدہ یا "یؤمنون بالغیب" کا درجہ نصیب ہوا۔ قبیلہ و برادری محض دنیاوی تعارف کے لئے ہے تاکہ دنیا میں رنگا رنگی اور رونق قائم رہے۔

ناسوتی شعور کی بے شمار جہتیں (dimensions) ہیں۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ فرد کا شعور خاندانی و معاشرتی چھاپ یا کسی دلچسپی کی بنا پر کسی بھی جہت میں گم ہو کر اس کو زندگی کا مقصد بنالیتا ہے اور کائناتی وسعت کے ذہن کو ایک ذرّے میں بند کر دیتا ہے لیکن ایک گروہ ایسا ہے جو حقیقت کی تلاش میں رہتا ہے— اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے خودشناسی کی دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ ان مقرب بارگاہ خواتین و حضرات کے لئے دنیاوی تقسیم و تخصیص بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفوں کی دنیا، اِس دنیا میں رہتے ہوئے بھی الگ ہوتی ہے۔

اللہ والوں کی خوب صورت روایت ہے کہ وہ دنیاوی لوازمات و اشغال کے اشاروں کنایوں میں بھی اپنے مقصود و منتہا یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا پسند کرتے ہیں اور میناو جام کے استعاروں میں عرفانِ الٰہی کا دم بھرتے ہیں۔ امام سلسلۂ عظیمیہ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ نے بڑی لطافت اور خوبی سے ساغر و پیمانہ، میناو جام اور خُم و صراحی کے استعاروں کو اپنی رباعیات میں استعمال کیا ہے۔ ابدالِ حق کی رباعیات کا انداز اور اسلوب اپنی نوعیت میں سب سے الگ اور منفرد ہے اور ان کی رباعیات کا مطالعہ کرنے والے اردو زبان کے بڑے شعرا اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

اکتوبر 2025ء کے "ماہنامہ قلندر شعور" کے سرورق پر درج ابدالِ حق کی رباعی میں غور وخوض کے لئے آپ کے شاگردِ رشید اور ممثّل حضرت خواجہ شمس الدین عظیمیؒ کی تشریحات سے راہ نمائی لیناضروری ہے۔ بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عارف کے لئے اِس دنیا اور کائنات میں کوئی شے اہم اورکشش کا باعث ہے تو وہ معرفت کی شراب سے لبریز مینا یا صراحی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی ہر شے اس کے لئے گورکھ دھندا ہے۔ عارف کے لئے روشن مقام وہ ہے جہاں اُس نے معرفت کے جام کا ذائقہ چکھا کیوں کہ اس اندھیری دنیا میں صرف "ساقی" کا مے کدہ منور ہے۔

(تشریح : مکمل مینا)

دنیا میں تو اک یہی مقام اپنا ہے　　مینا ہے جہاں وہیں قیام اپنا ہے
ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہے عظیمؔ　　روشن جو یہاں ہے ایک جام اپنا ہے

ابدالِ حق کی رباعی میں مادی دنیا اور روحانی شعور کی عمدہ منظر کشی ہے۔ ماہِ اکتوبر کی مناسبت سے "ماہنامہ قلندر شعور" کے سرورق پر یہ رباعی پڑھی تو ذہن خاموش ہوگیا لیکن دل اس مصرعے کو دہراتا رہا کہ "روشن جو یہاں ہے ایک جام اپنا ہے"۔

یہ رباعی کہتی ہے کہ دنیا میں انسان کا اصل مقام ساقی کے مے کدے میں قیام ہے۔ وہ ظاہری عروج کی بجائے باطنی تکمیل کی چاہت رکھتا ہے۔ جہاں انسان کو جامِ معرفت یا سوزِ عشق نصیب ہو، وہی منزل ہے۔ رباعی کا تیسرا مصرعہ "ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہے عظیمؔ" دنیا کی حالتِ زار کی تصویر ہے۔ فریب اور غفلت نے ہر طرف تاریکی پھیلا دی ہے۔ اس اندھیرے میں کہیں روشنی ہے تو وہ عشقِ حقیقی، ساقی کا مے کدہ اور عرفان کا جام ہے۔ یہ رباعی ظاہر و باطن، روشنی و تاریکی، فریب و حقیقت اور زندگی کے حقیقی مقصد "معرفتِ الٰہی" کے نکتے کو سادہ مگر نہایت پُر اثر اور عارفانہ انداز میں بیان کرتی ہے۔ (مریم توقیر۔ اسلام آباد)

لامحدود سوچ

جب تک انسان کی سوچ انفرادی رہتی ہے، وہ محدود رہتی ہے اور جب انسان کی سوچ انفرادی نہیں رہتی اور اس کی سوچ میں اجتماعیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جو کچھ اپنے لئے چاہتا ہے، وہ دوسروں کے لئے بھی چاہتا ہے تو اس کی محدودیت ٹوٹ جاتی ہے پھر اس کی فکر محدود دائرے سے نکل کر لامحدود دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ محدود کا مطلب یہ ہے کہ جس کی آپ حد بندی کر سکیں، لامحدود وہ چیز ہے جس کی حد بندی تو کر سکیں لیکن وہ حدود میں نہ ہو۔ مثلاً آپ کے پاس ایک زمین ہے، اس میں دس کھیت ہیں۔ دوسری زمین ہے، اس میں بیس کھیت ہیں۔ تیسری زمین ہے جس میں یہاں سے وہاں تک، وہاں سے یہاں تک کھیت ہیں تو یہ دس کھیت محدودیت کے دائرے میں آتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دس کھیت کے بعد ہزار کھیت ہیں لیکن یہ پتہ ہے کہ بے شمار زمین ہے۔ یہ لامحدود لیکن محدود ہے اس لئے اگر حد بندی کی جا سکے تو اس کی حد بندی ہو سکتی ہے۔ یہی اجتماعیت ہے۔ اب آپ اجتماعیت کے دائرے سے نکل کر لامتناہیت میں داخل ہو گئے۔ آپ کا ذہن لامحدود ہو گیا، اب آپ جو بھی سوچیں گے، وہ محدود دائرے سے باہر سوچیں گے اور جب آپ لامتناہیت کے دائرے سے باہر سوچیں گے، آپ کی سوچ لامحدود ہو جائے گی۔

محدود دائرہ یہ ہے کہ ایک باپ اپنی اولادوں کے لئے سوچتا ہے کہ میری اولاد تعلیم یافتہ ہو۔ ان کے پاس پیسے ہوں، گھر ہو وغیرہ۔ وہ سوچتا ہے میرے بھائی ایسے ہوں، میرے دوستوں کو مجھ سے فائدہ پہنچے۔ یہ بہر حال محدود سوچ ہے۔ اب اس محدود سوچ سے نکلنے کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ میری قوم کو مجھ سے میری ذات سے فائدہ پہنچے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ میری سوچ سے پوری نوع کو بلکہ کائنات کے اندر جتنے بھی عوامل ہیں، ان کو فائدہ پہنچے۔ یہ لامحدود سوچ ہے لیکن محدود سوچ ہو یا لامتناہیت کی سوچ، اس کی مشق اور وہ عمل انفرادیت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اگر انفرادیت سے وہ عمل شروع نہیں ہو گا تو کسی طرح تکمیل نہیں ہو گی۔ (کتاب: ذات کا عرفان)

محمد عدنان خان

کورشِ اعظم

زمانیت کی بے رنگی سے طلوع ہونے والی مکانیت کے طول و عرض پر پھیلی ایک ایسے سرخیل رَزم و بزم طلسم کی داستان جس کے قدموں کی دھمک سے زمین لرزہ براندام تھی اور جس کے نام کا کواکب میں شہرہ تھا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: قدیم سلطنت فارس کی ابتدا موجودہ ایران کے قدیم علاقے انشان سے ہوئی جس کا حکمران کمبائسس تھا۔ وہ مدائن (میڈیا) کے بادشاہ استغیز کا داماد تھا۔ کمبائسس اور شہزادی منڈانہ شادی کے کئی سال تک بے اولاد تھے۔ ایک شب منڈانہ نے خواب دیکھا جس کی تعبیر بادشاہ کے لیے پریشان کُن تھی۔ اس نے وزیر ہاراپاگس کی مدد سے بچے کو مارنے کا منصوبہ بنایا۔ شاہی چرواہے میتھرابیٹس اور اس کی طبیبہ بہن کو جبراً ذمہ داری سونپی گئی۔ جس روز شہزادی کے ہاں ولادت ہوئی، اسی روز چرواہے کے گھر مردہ بچہ پیدا ہوا۔ طبیبہ نے بچہ تبدیل کر کے بھائی کو دے دیا۔ بچے کا نام کورش رکھا گیا۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ ایک روز شاہی لڑکوں نے اس کی بکریوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ اس نے انہیں مار بھگایا اور بعد میں گرفتاری دے دی۔ بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس کے نقوش دیکھ کر چونک گیا۔ کورش کی حقیقت معلوم ہونے پر بادشاہ کی نیند اڑ گئی۔ مارنے کی کوشش پر وہ زندان سے فرار ہو گیا۔ ملکہ اور منڈانہ کو حقیقت معلوم ہوئی۔ منڈانہ کورش کو انشان لے آئی۔ مدائن پر استغیز کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور ایک بڑی جنگ کے بعد کورش نے اسے فتح کر لیا۔ کورش کی کساندانے سے شادی ہو گئی۔ اس دوران میں لیڈیا کا محاذ سرگرم ہونے لگا۔ وہاں کے حکمران کروسس نے معمولی جھڑپوں کے بعد فارس پر بڑا حملہ کر دیا۔ اب آگے پڑھیے۔

سلطنت لیڈیا دریائے ہیلیز کو پار کرنے کے لیے اُس دور کی جدید ٹیکنالوجی سے لیس تھی۔ کروسس کے جرنیل اپنے بادشاہ کی خواہش پر فارس کے خلاف حملہ کرنے پر راضی ہو گئے۔

ادھر فارس کے حکمران کورش اور کمبائسس بھی مقابلے کے لیے تیار تھے۔ کروسس کے پاس اکھال ٹیک نسل (Akhal-Teke) کے توانا اور پھرتیلے گھوڑے تھے جب کہ کورش کی سپاہ

کے پاس مختلف نسل کے گھوڑے تھے۔ ان میں نیسین (Nisean) نسل کے گھوڑے زیادہ تھے۔ اس کے ذاتی استعمال میں ایک سے زیادہ گھوڑے تھے۔ ان میں منڈانہ کی جانب سے ملنے والی چاندی کی مانند چمکتی دمکتی اکھال ٹیک نسل کی گھوڑی بھی تھی۔ کورش نے محسوس کیا تھا کہ گھوڑے، اونٹ کے جسم کی بو سے گھبرا جاتے ہیں۔ بعض گھوڑے اونٹوں کو دیکھ کر بدک جاتے تھے۔ اس پر کئی تجربات کر کے وہ سمجھ گیا کہ اکھال ٹیک نسل، اونٹ کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ کورش نے کمبائسس کو اونٹوں پر مشتمل ایک بڑا فوجی دستہ تیار کرنے کا کہا۔ اس نے اونٹوں پر سواری کے لیے ان سپاہیوں کا انتخاب کیا جن کے وزن کم تھے۔

کورش کی فوج خاموشی سے جنگ کی تیاری کر چکی تھی۔ لیڈیا نے چھوٹی موٹی کارروائیاں شروع کر دی تھیں لیکن کورش نے ردِّ عمل میں اپنے دفاع کی حد تک لڑنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کروسس بڑا حملہ کرنے کی ہمت کرے تاکہ اسے بھرپور جواب دیا جائے۔

اس دوران کورش فارس سے ملحقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور جاگیروں کو اپنی حدود میں شامل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ سلطنتِ فارس پھیل رہی تھی۔ کورش نے خراج اور محصولات کا اعلیٰ نظام متعارف کرایا تھا جسے دیکھ کر اکثر ملحقہ جاگیریں فارس میں شمولیت کی خواہش مند تھیں تاکہ دفاعی تحفظ، حکومتی اصلاحات، خوراک، صحت، تعلیم کے ساتھ قدرتی آفات میں امداد جیسی سہولیات میسر آئیں۔

کورش کی حکمتِ عملی سے لاعلم لیڈیا، دریائے ہیلیز کو پار کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ ان کے خیال میں فارس میں ان کا مقابلہ کرنے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی دراندازیوں پر فارس کی جانب سے جواب نہیں دیا جاتا تھا۔ جواب نہ دینا وہ 'دانہ' تھا جسے لیڈیا کی سپاہ بڑی رغبت سے چگتی جا رہی تھی۔

ایک رات طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک بڑی چھاپہ مار کارروائی کے پردے میں دریائے ہیلیز پار کر لیا۔ فارس کی فوج حکمتِ عملی کے تحت پیچھے ہٹ رہی تھی جو لیڈیا کے نزدیک پسپائی تھی۔ وہ سرحد سے کافی اندر آ گئے تھے۔

رات ڈھلی — روشنی معدوم ہوئی تو جنگ بندی کے لیے نقارے بجا دیے گئے اور لیڈیا کی افواج

مناسب جگہ دیکھ کر خیمہ زن ہوگئیں۔ فارس کا کچھ علاقہ بظاہر ان کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ کورش کی ہدایت تھی کہ جوابی کارروائی کے بغیر انہیں مزید آگے بڑھنے سے روکا جائے۔

لیڈیا کی سپاہ یخ بستہ موسم میں کھلے میدان میں خیمہ زن تھیں۔ رات مشکل سے گزری۔

سردی میں کانپتے ٹھٹھرتے سپاہی اگلی صبح صف آرا ہوئے اور پیش قدمی کی۔ فارس کی سپاہ کی جانب سے ایسا دندان شکن جواب دیا گیا کہ دشمن فوج کے ہوش اڑ گئے۔ غرور اور اعتماد زمیں بوس ہوگیا۔ زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا۔ کورش کی ہدایت تھی کہ دشمن کو نہ پیچھے دھکیلنا ہے نہ خود آگے بڑھنا ہے اور نہ انہیں مزید آگے بڑھنے دینا ہے۔

لیڈیا کی فوج کو دریائے ہیلیز سے مسلسل امداد پہنچ رہی تھی۔ شام تک لڑائی جاری رہی۔ رات ہوئی تو جنگ بندی کے نقارے بجا دیے گئے۔

اگلی صبح پھر لیڈیا کی فوج نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک بار پھر شدید مزاحمت ملی۔ جانی نقصان اپنی جگہ، فارس کی پوزیشن مستحکم تھی اور دشمن کے صبر کے پیمانے کو آزما کر انہیں اپنی ہی سازش میں تھکا رہی تھی۔

لیڈیا کی سپاہ کے آگے بڑھنے کی کوشش میں کئی روز گزر گئے۔ فارس کے دستے سیسہ پلائی دیوار کی مانند اپنی جگہ سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے۔ دشمن نے سوچنا شروع کر دیا کہ کہیں ہم کورش کے جال میں تو نہیں پھنس گئے—؟ اصل میں ان لوگوں نے فارس کی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اوپر سے موسم کی شدت نے ان کی قلفی جمادی تھی۔

کروسس کو اس کے جرنیلوں نے خطوط لکھے اور صورتِ حال سامنے رکھ کر درخواست کی کہ سپاہیوں کی بڑی تعداد سردی کی شدت سے بیمار ہو رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً ہونے والی بارشوں سے جانور بیمار ہو رہے تھے۔ حالات دیکھ کر کروسس نے اراکینِ حکومت سے مشاورت کے بعد موسم سازگار ہونے تک واپسی کے احکامات جاری کر دیے۔ اس کی فوج میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تیزی سے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ ہوشیار ضرور تھے لیکن جانتے تھے کہ فارس کی سپاہ نے اب تک خود سے کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ ان کے لیے کسی حد تک اطمینان کا باعث

تھا۔ کورش جانتا تھا کہ لیڈیا کی سپاہ موسم کی سختی کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ دریائے ہیلیز تک انہیں کچھ نہیں کہا گیا۔ دریا پار کرتے ہی فارس کی افواج نے لیڈیا کے بنائے گئے عارضی پلوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ پل اس دور کی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ اور راتوں رات بنائے گئے تھے۔ قبضے کے فوراً بعد کورش نے حملے کا حکم دے دیا اور واپس جاتی فوج کے اوسان خطا ہو گئے۔ شدید افراتفری پھیل گئی۔ افسران نے بڑی مشکل سے انہیں منظم کیا۔ جب تک وہ منظم ہوئیں، فارس کی افواج تھمبرا کے میدانوں تک پہنچ گئی تھیں اور لیڈیا کے کئی سرحدی علاقوں پر قبضہ کر کے آخر کار تھمبرا کے میدان میں خیمہ زن ہو گئیں۔ اب تک کی کارروائی میں فارس کے گھڑ سوار دستوں نے حصہ لیا تھا، شتر سوار دستے ان کے پیچھے تھے۔

فارس کے فوجی اہداف حاصل کرتے ہوئے پہلے سے طے شدہ علاقوں تک پہنچ کر عین اُس جگہ خیمہ زن ہوئے جو عسکری کامیابی کے لحاظ سے اہم تھا۔ یہاں سب کچھ میسر تھا، تازہ اور گرم پانی کے چشمے کے ساتھ جنگل میں موجود پھل خداتی (جاپانی پھل)، میدلار (لوکاٹ) کے درختوں کی بہتات کے ساتھ جنگلی چیری کے درخت تھے۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ سٹرس فروٹ (ترش رس دار پھل) کی کچی پکی اقسام درختوں پر موجود تھیں۔ وہ جن علاقوں پر قبضہ کر کے آگے بڑھتے گئے، پیچھے تیزی سے مضبوط فوجی چوکیاں بناتے گئے۔ ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فارس کی تیاری اتنی بہترین تھی کہ غلطی کا امکان نہیں تھا۔

کورش کی ہدایت کے مطابق فوج خیمہ زن ہو چکی تھی اور لیڈیا کے ردِّعمل کی منتظر تھی۔ کورش کو معلوم تھا کہ جس نقصان سے لیڈیا کی فوج گزری تھی، جوابی کارروائی کے لیے ان کو دو سے تین دن لگنے تھے۔ کورش دلیر تھا۔ ان کو سنبھلنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ ایسا ہی ہوا۔ دو دن تک لیڈیا کی جانب سے خاموشی رہی البتہ دونوں طرف کے فوجی آمنے سامنے رہے۔

تیسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو لیڈیا کی جانب سے نقاروں پر ضربیں لگنے لگیں۔ اُدھر کمبائسس نے بھی کوسِ حربی بجانے کا حکم دے دیا۔ دونوں جانب سے نقارے بجنے لگے۔ لگتا تھا کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔

فارس کے لیے تیار کی گئی جنگ اب لیڈیا کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ عوام پر ہیبت طاری تھی کہ فارس کے فوجی ان کی سرزمین پر موجود ہیں اور اتنے زوردار انداز میں نقارے بجا رہے ہیں کہ کروسس کا اعتماد بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ڈیلفی سے واپس آنے کے بعد وہ بہت پُراعتماد تھا۔ احساس نہیں ہوا کہ اس نے پیغام کو غلط سمجھا ہے۔

نقارے بازی کا مقابلہ کئی گھنٹے جاری رہا، اس دوران لیڈیا کے گھڑ سوار اکھال ٹیک نسل کے چمک دار گھوڑوں پر صف آرا ہو چکے تھے لیکن فارس کے گھڑ سوار تتر بتر اور بے ہنگم نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں فارس کے لیے بجائے جانے والے نقاروں کے آواز و انداز بدلے تو وہ منظم ہو کر دائیں بائیں سے پیچھے ہٹنے لگے۔

منظر ایسا تھا کہ گھوڑے خود کار انداز اور قطار میں تیزی سے پیچھے کی طرف جانے لگے۔ لیڈیا کے سپاہی سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا جب انہوں نے گھڑ سواروں کے پیچھے سے برآمد ہونے والے منظم انداز میں کھڑے اونٹوں کے دستوں کو دیکھا۔ لیڈیا نے مزید انتظار کیے بغیر گھڑ سواروں کو حملے کا حکم دے دیا۔

اُدھر سے گھوڑوں پر سوار لیڈیا کے سپاہی تلواریں لہراتے ہوئے آگے بڑھے، اِدھر سے فارس کے شتر سوار دوڑے۔ وہ اونٹوں کی لگامیں پیچھے کھینچے ہوئے انہیں دوڑا رہے تھے۔ اونٹوں کو اپنی جانب آتا دیکھ کر لیڈیا کے گھوڑے بدکنا شروع ہوئے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ایسی افراتفری مچی کہ جس کا اندازہ اور اس کے حل کا کروسس کے لوگوں کو پتہ نہیں تھا۔ وہ تمام تر کوشش کے باوجود، گھوڑوں پر قابو پانے میں ناکام تھے۔ فارس کے شتربان تیزی سے غالب آ رہے تھے اور تھمبرا کا میدان لیڈیا کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

تھمبرا کے میدان میں لڑی گئی Battle of Thymbra میں کورش کی ذہانت اور اعلیٰ جنگی حکمتِ عملی سے لیڈیا کو شکستِ فاش ہوئی۔ فارس نے ان کا غرور خاک میں ملا دیا۔ تتر بتر ہونے والے دستے بآسانی زیر ہو گئے۔

میڈیا (مدائن) کے بعد کورش کی یہ دوسری اور بڑی فتح تھی۔ تھمبرا کے میدانوں پر تسلط قائم کر لینے کے ساتھ فارس کی افواج رکی نہیں

بلکہ اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ لیڈیا کی فوج کے حوصلے پوری طرح پست ہو چکے تھے۔ وہ ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھی۔

کروسس دارالحکومت ساردس کے قلعے میں چھپ گیا تھا۔ کورش کے حکم پر ساردس کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا اور سامانِ رسد و خورونوش کے راستے مسدود کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی کورش کی افواج نے اہم عمارتوں پر قبضہ کر کے سلطنت کا کنٹرول سنبھال لیا۔

لیڈیا کا سیاسی اور انتظامی ڈھانچا مستحکم تھا اس لیے کورش کو اسے فارس کے ساتھ ضم کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ لیڈیا کے عوام کورش کے متعلق کافی کچھ جانتے تھے لہٰذا ان میں خوف و ہراس کا وہ عالم نہیں تھا جو کسی ظالم حکمران کے تسلط میں جانے سے عوام پر طاری ہوتا ہے۔ کورش نے ہمیشہ کی طرح فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ عوام اور عہدہ داران کے ساتھ نرمی اور احترام کا رویہ رکھا جائے۔

کورش جانتا تھا کہ لیڈیا خوش حال سلطنت تھی، عوام غریب نہیں تھے۔ بس انہیں بہترین تعلیمی و تفریحی سہولیات کے ساتھ جدید اور منظم نظام کی ضرورت تھی۔ اس نے جگہ جگہ عوامی اجتماعات میں جن اقدامات کا اعلان کیا، وہ ادارہ جاتی سطح پر عوامی بالادستی سے متعلق تھے جس کی لیڈیا میں کمی تھی۔

ٹیمولس پہاڑ (موجودہ نام بوزداگ) کے دامن میں واقع لیڈیا کے دارالحکومت ساردس میں تمام عسکری قوت اکٹھی ہو گئی تھی۔ ساردس فارس کی افواج کے سخت محاصرے میں تھا جو دو ہفتے جاری رہا۔ آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کیا گیا۔ نتیجے میں ساردس میں اشیائے خورونوش کی کمی ہونے لگی اور سات دن میں قلت ہو گئی۔

لیڈیا خوش حال سلطنت تھی۔ فاقہ کشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ساردس کے قلعے میں محصور لوگوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی، وہ غذا کے لیے دست و گریباں ہو گئے۔ خوراک کے ذخیرے پر افسروں نے قبضہ کر لیا۔ نتیجے میں سپاہی نظم و ضبط میں نہ رہے۔ داخلی مقامات کا حفاظتی نظام کمزور پڑ گیا۔ دو ہفتے گزرتے ہی کورش کی فوج معمولی مزاحمت کے بعد ساردس کے قلعے میں داخل ہو گئی۔ (قسط: ۲۶)

DEFENCE
3D - OPG - CEPH

3 DIMENSIONAL DENTAL IMAGING CBCT SYSTEM

KARACHI

3D

Free software provide with implant library to all consultant for Nerve Tracing. Cephalomatric Tracing, Implant Planing.

Maxillofacial

Implant Planning

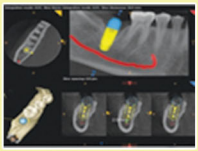

OPG

CEPH

Take Your Practice to the Next Level !

Defence branch:
0213-8941506 - 0343-7180348
Building # 7-C, Shop # 1, Street 10, Badar Commercial Area, Phase 5 Ext. DHA, Karachi.

Sharfabad branch:
0213-4920777 - 0320-4690899
Plot # 87, Shop # 2, Zulekha Tower, Block-3, BMCH Society, Main Jamal-ud-Din AfghaniRoad, Sharfabad, Karachi.

Email: info@3d-diagnostic.pk Web: www.3d-diagnostic.pk

عظیمی انسٹیٹیوٹ آف کلر تھراپی

سرپرست:

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی رحمۃ اللہ علیہ

حکومتِ پنجاب سے منظور شدہ

TEVTA NAVTCC PBTE

NCT

کلر تھراپی ڈپلومہ کورس

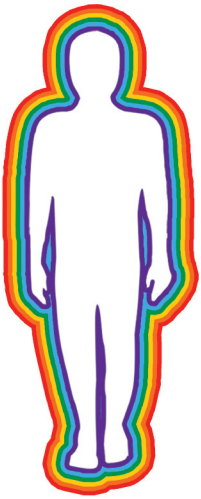

Career Opportunities

Graduates of this course can find employment opportunities in the following areas:

- Colour Therapy Clinics
- Alternative Medicine Departments
- Alternative Medicine Research Centers

WhatsApp
0334-6396370

Email
azeemi.colourtherapy@gmail.com

Website
www.azeemicolourtherapy.com

Head Office
204-B Tariq Gardens, Lahore

Sub Office
Azeemi Hospital, Kahna Nau, Lahore.

فقر میرا فخر ہے

فارسی ادب میں ”مثنوی مولوی معنوی“ کا منفرد مقام ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف چھ دفاتر پر مشتمل ہے جن میں اشعار کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف کا سبب مولانا رومؒ کے مرید حسام الدین چلپی بنے۔ مولانا رومؒ نے دفترِ اول کے علاوہ ہر دفتر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی دلچسپ پیرائے میں ظاہر و باطن کا احوال ہے جس سے ہر شخص فہم و فراست کے مطابق حکمت حاصل کرتا ہے۔ یہ مثنوی سادگی، روانی، منقولات و معقولات، نصیحت آمیز جملوں، تلمیحات و استعارات اور دلچسپ واقعات و تمثیلات کی وجہ سے ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ ”ماہنامہ قلندر شعور“ کے قارئین کے لیے مولانا رومؒ کی مثنوی کا اردو ترجمہ اختصار کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

ایک رات بدّو عورت نے اپنے فقیر شوہر سے غربت پر جھگڑا کیا اور گفتگو حد سے بڑھا دی۔ کہا، ہم محتاجی اور سختیاں جھیلتے ہیں، ساری دنیا خوش ہے اور ہم ناخوش ہیں۔ ہمارے لیے روٹی نہیں ہے، ہمارا سالن درد و رشک ہے۔ ہمارے پاس پیالہ نہیں ہے، ہمارا پانی آنسو ہیں۔ ہمارا لباس دن میں سورج کی دھوپ ہے۔ رات میں بچھونا اور لحاف، چاندنی ہے۔ ہم نے چاند کی ٹکیا کو روٹی کی ٹکیا سمجھا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیے ہوئے ہیں۔ ہماری غربت ذلت ہے۔ دن رات روزی کی فکر ہے۔ اپنا اور پرایا ہم سے گریزاں ہے جیسا کہ سامری[1] انسانوں سے۔ کسی سے ایک مٹھی مسور مانگوں تو وہ کہتا ہے کہ چپ ہو جا، غم کھائے جا اور مرجا۔

عرب کے لیے جنگ اور بخشش موجبِ فخر ہے اور ہم ایسے ہیں جیسے خط میں حرفِ غلط۔

۱۔ مترجم نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کو بچھڑے کی پرستش پر لگانے والے سامری کا یہ حال ہوا کہ جو کوئی اس کو چھوتا تھا، دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا اس لئے وہ لوگوں سے بچتا پھرتا تھا۔

ہم غذا کے بغیر مردہ ہیں یا موت کی تلوار سے پریشان ہیں۔ کیسی خطا—؟ ہم بلاقصور آگ میں ہیں۔ دوا کیسی—؟ ہم تو درد و غم سے پامال، بھیک مانگنے پر آمادہ اور ہوا میں مکھی کے نشتر مارتے ہیں۔ مشقت اور غربت سے رسوا ہو گئے۔ پریشانی اور مجبوری سے جل گئے ہیں۔ کب تک ذلت برداشت کریں؟ آگ کے سمندر میں غرق ہیں۔ کسی روز مہمان آجائے، انتہائی شرمندگی اٹھانی پڑے اور ہم مہمان کا جوتا بیچ کھائیں گے۔

اس طور پر یہ قصہ اور گفتگو بیان سے بڑھی۔

سمجھ داروں نے کہا ہے کہ محسنوں کا مہمان بننا چاہئے۔ تو ایسے شخص کا مہمان ہے جو تیری کمائی بے حسی سے وصول کرلے یعنی مہمان کا جوتا بیچ کھانے والے کی اخلاقیات دیکھ۔

بدّو نے بیوی کو صبر کا حکم دیا اور صبر کی فضیلت بیان کی۔ کہا تو آمدنی کی کب تک جستجو کرے گی؟ زندگی کتنی رہی ہے، زیادہ تو گزر گئی ہے۔ سمجھ دار کمی بیشی کو نہیں دیکھتا کہ دونوں بہاؤ کی طرح گزر جاتے ہیں۔ صاف ہو یا بہاؤ کی گدلی رَو ہو، وہ ٹھہرنے والی نہیں ہے، اس کا ذکر نہ کر۔ دنیا میں ہزاروں جاندار بغیر کسی تردّد[۲] کے آرام سے جی رہے ہیں۔

فاختہ درخت پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہے حالاں کہ اُس نے رات کا کچھ سامان نہیں کیا ہے۔

بلبل، خالق کی تعریف کرتی ہے کہ اے قبول کرنے والے! رزق کا تجھ پر بھروسا ہے۔

بازنے بادشاہ کے ہاتھ کو دعوت نامہ بنا کر تمام مُرداروں سے امید منقطع کرلی۔

اسی طرح مچھر سے لے کر ہاتھی تک سب مخلوقات خالقِ کائنات اللہ کا کنبہ ہیں اور اللہ بہترین پرورش کرنے والا ہے۔

بدّو شوہر نے بیوی سے کہا، یہ غم جو سینوں میں ہیں، ہماری ہستی کے غبار اور بگولے ہیں۔ یہ جڑ کھودنے والے غم ہمارے لیے درانتی کی طرح ہیں۔ 'اس طرح ہو گیا'، 'اُس طرح ہو گیا' سب وسوسے ہیں۔ سمجھ لے کہ رنج و غم موت کے اجزا ہیں اور موت سے مفر نہیں[۳]۔ جس کو مصائب جھیلنے کی عادت نہیں، موت کے وقت اس کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس کو روحانی فنا میٹھی لگنے لگے، اسے جان لینا چاہئے کہ اس پر اللہ کی عنایت نازل ہوئی ہے کیوں کہ

۲۔ شک، پریشانی، اندیشہ ۳۔ موت سے گریز یا فرار نہیں ہے۔

مٹھاس کا سرچشمہ اللہ کی ذات وصفات ہیں۔

دنیا کی ہر گھڑی دراصل ایک موت ہے۔ ہر لمحہ کچھ نہ کچھ ختم ہوتا ہے، کچھ نیا پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں زندگی کا راز ہے۔ جو شخص نفس پرست اور خودی میں فربہ[۴] ہے، اسے فنا کے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ روحانی راستے پر اس کے لیے موت (فنا) ناگزیر ہے تاکہ وہ پاک ہو۔ جو اپنے نفس کو دبلا کر چکا ہے، وہ خود غرضی سے آزاد ہے، اللہ اسے بلندی عطا کرتا ہے، وہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے۔

اے چاند! رات گزر گئی اور صبح ہو گئی، تو اس قصے کو کب تک دہرائے گی؟ جب تو جوان تھی تو زیادہ صابر تھی۔ زر کی طلب گار بن گئی جب کہ پہلے تو خود زر تھی۔ تو میوے سے بھری انگور کی بیل تھی، کیوں خراب ہو گئی؟ میوہ پکنے کے وقت اس میں سڑاند پیدا ہو گئی۔ چاہئے تھا کہ تیرے اندر مٹھاس بڑھتی۔

تو میرا جوڑا ہے۔ جوڑے کو یکساں ہونا چاہئے تاکہ مصلحت اور حالات کے مطابق چلے۔ جوتے اور موزے، دونوں کے جوڑے دیکھ۔ ان میں سے اگر ایک جوتا پیر میں تنگ آئے تو پورا جوڑا کام میں نہیں آتا۔ تو نے دیکھا ہے کہ جنگل کے شیر کا جوڑا بھیڑیا ہو؟

دنیا کی گاڑی دو بوروں کی مانند ہے جنہیں ایک اونٹ[۵] اٹھائے ہوئے ہے۔ ایک بورا نفس کا ہے جو خود غرضی سے خالی ہونا چاہئے۔ دوسرا روح کا ہے جو اللہ کی محبت اور معرفت سے بھرا ہوا ہونا چاہئے۔ دونوں بورے بھرے ہوئے ہوں یعنی مادیت پرستی بھی ہو اور روحانی سفر کی چاہ بھی تو وہ توازن کھو دیتا ہے۔

فقیر نے بیوی سے کہا، میں قناعت کی طرف جاتا ہوں۔ تو برائی کی طرف کیوں جاتی ہے؟

صابر مرد، خلوصِ نیت اور دل سوزی سے صبح ہونے تک بیوی کو سمجھاتا رہا۔

بیوی اس پر چیخی کہ اے عزت کے شیدائی! مزید تیرے فریب میں نہ آؤں گی۔ اپنا کام اور حال دیکھ اور شرم کر۔ تکبر اور فقیری کا دعویٰ دل سے نکال دے تاکہ تو نجات پائے۔ تکبر برا ہے اور مفلسوں سے اور زیادہ برا ہے۔ ٹھنڈا دن اور برف، کپڑے بھیگے ہوئے۔ دعوے اور مونچھوں کا تاؤ کب تک؟ اے وہ کہ تیرا گھر

۴۔ موٹا ۵۔ تمثیلی انداز میں آدمی کا ذکر ہے۔

مکڑی کے جالے کی طرح ہے۔ تو نے قناعت سے کب روح روشن کی ہے؟ تو نے قناعتوں کا نام سیکھ لیا ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے،

"قناعت کیا ہے؟ خزانہ ہے۔"

تو رنج اور گنج میں فرق نہیں سمجھتا۔ قناعت تو گنجِ رواں ہے۔ اے چلتے پھرتے رنج و غم! مجھے بیوی نہ کہہ اور شوہر ہونے کا اظہار نہ کر۔ تو خالی پیٹ بانسری کی طرح آہ و فریاد کرتا ہے۔ میری جانب حقارت اور ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھ تاکہ تیری رگ رگ کا حال نہ کہہ ڈالوں۔ تو نے اپنی عقل کو میری عقل سے بڑا سمجھا ہے تو مجھ کم عقل کو کیوں پسند کیا؟ تیری عقل سے بے عقل ہونا اچھا ہے۔

ہائے تعجب! تو سانپ بھی ہے اور منتر پڑھنے والا بھی۔ کوّا اگر اپنی بدصورتی کو پہچان لیتا، رنج اور غم سے برف کی طرح پگھل جاتا۔ منتر پڑھنے والا دشمن کی طرح پڑھتا ہے۔ وہ سانپ پر منتر اور سانپ اس پر منتر پڑھتا ہے۔ سانپ کے منتر کا اثر یہ ہے کہ سپیرا سانپ کے شوق میں مبتلا ہے۔ اگر سانپ کا منتر اس کے لیے جال نہ ہوتا، وہ سانپ کے منتر کا شکار کب بنتا؟ منتر پڑھنے والا کمائی اور حرص کی وجہ سے اس وقت سانپ کے منتر کو محسوس نہیں کرتا۔ سانپ کہتا ہے، اے سپیرے، خوب دیکھ لے! تو نے اپنا منتر دیکھا، میرا منتر بھی دیکھ لے۔ اللہ کے نام نے مجھے باندھا ہے نہ کہ تو نے۔ میں نے اللہ کے نام پر جان اور جسم کو سپرد کر دیا ہے تاکہ میرے زخم کے بدلے تیری جان کی رگ کاٹ دے یا تجھے میری طرح قید خانے میں ڈال دے۔

عورت سخت باتیں شوہر کو سناتی رہی۔

مرد نے طعنے سنے تو کہا، اے بیوی! تو عورت ہے یا مجسمِ غم؟ مجھے طعنہ نہ دے۔ فقر باعثِ فخر ہے۔ مردِ خدا بینائی کی طرح ہے۔ پس بینائی کھلی اچھی ہے یا ڈھکی ہوئی—؟ فقیر کان کے سونے جیسی بات کہے، اس کا قیمتی سامان عام دکان میں دستیاب نہیں ہوتا۔

درویشی کا معاملہ تیری سمجھ سے اونچا ہے۔ تو حقارت سے درویشوں کو نہ دیکھ کیوں کہ درویشی دنیوی کاموں سے جدا ہے۔ درویشوں کے لیے اللہ کی طرف سے ہر وقت بخشش ہے۔ درویش ملکیت و مال سے ماورا ہیں۔ ان کی روزی، رزق اور تسکین بازار، دکان اور دنیا سے نہیں، اللہ کی

حضوری سے آتی ہے۔ ان کی روزی سطحی نہیں گہری ہے — یہ دنیاوی نوالہ نہیں، معرفت کی تسکین ہے۔ درویش زمین کے اناج سے نہیں، اللہ کی محبت سے سیر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ عادل ہے اور عادل کمزوروں پر ظلم نہیں کرتے کہ ایک کو نعمت اور سامان دیں اور دوسرے کو آگ پر رکھیں۔ اس شخص کو آگ جلائے جو دونوں جہان کے خالق کے بارے میں یہ گمان کرے۔

"فقر میرا فخر ہے۔" اس بات میں مبالغہ ہے اور نہ یہ بے بنیاد ہے۔ فقر کی باطنی دولت کو پانے والا جس روحانی مرتبے اور وقار تک پہنچتا ہے، اس میں روحانی راز ہیں۔ تو نے غصے سے میرے بہت نام دھرے — مجھے سانپ جیسی خصلت والا اور سپیرا بتایا۔ اگر میں سانپ پکڑتا ہوں اور اس کے دانت اکھاڑ دیتا ہوں تو اس لیے کہ وہ کسی کو ڈسے نہیں اور کوئی دانتوں کی وجہ سے سانپ کو نہیں مارے، دانت اس کی جان کے دشمن ہیں۔ میں دشمن کو اس علم کے ذریعے دوست بناتا ہوں۔ میں لالچ کی وجہ سے منتر نہیں پڑھتا۔ میں نے لالچ کو اوندھے منہ کر دیا ہے۔ میرے دل میں قناعت کا ایک جہان ہے۔ اپنے گمان سے مجھے نہ دیکھ۔ جب تو گھومے اور سر چکرانے لگے تو تجھے ایسا لگے گا کہ گھر گھوم رہا ہے حالاں کہ گھومنے والی تُو ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں پڑھیے۔)

استغنا کیا ہے—؟

ضروریاتِ زندگی گزارنے میں بندے کا اپنا ذاتی ارادہ یا اختیار شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اگر مرغی کھلاتے ہیں، اُس میں خوش رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر چٹنی سے روٹی دیتے ہیں، اُس میں بھی خوش رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کھدّر کے کپڑے پہناتا ہے، بندہ اس میں بھی خوش رہتا ہے— مطلب یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے ہر عمل اور حرکت کو اللہ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے بندے کے اندر توکّل اور بھروسا پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ استغنا کے دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ توکّل اور بھروسا دراصل ایک خاص تعلق ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان براہِ راست قائم ہے اور جس بندے کا اللہ کے ساتھ یہ رابطہ قائم ہو جاتا ہے، اس بندے کے اَندر سے دنیا کا تمام لالچ نکل جاتا ہے۔

(کتاب: خطباتِ لاہور)

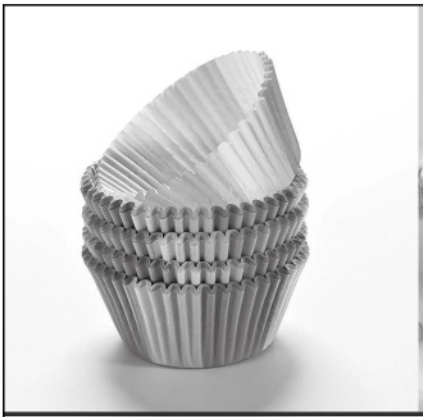

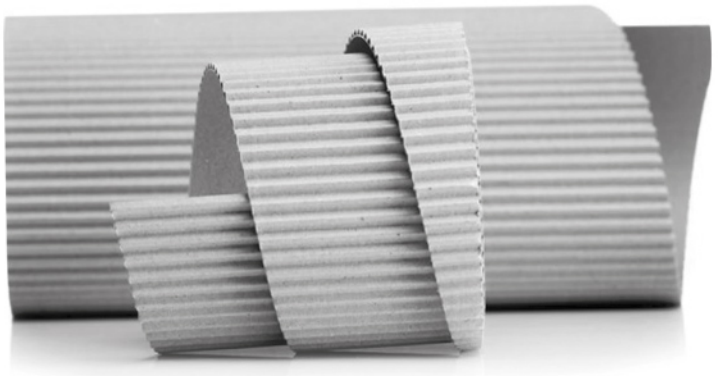

Manufacturer of
Liner & Floating Paper

PRIME PACK INDUSTRIES

C-21, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880627
Fax: 022-3880381

خواب تعبیر اور مشورہ

ادارہ "ماہنامہ قلندر شعور" ماضی کے اُن خوابوں کو دوبارہ شائع کر رہا ہے جن کی تعبیر میں محترم عظیمی صاحبؒ نے علمی توجیہ و تشریح بیان فرمائی اور مستقبل کی پیش گوئی کی۔

ذبیحہ

(ممتاز علی): ایک ریگستان ہے۔ ریگستان میں چھوٹے بڑے بہت سے ٹیلے ہیں۔ آندھی کے جھکّڑ چل رہے ہیں۔ ہوا ریت اڑا کر ایک ٹیلے کو دوسری جگہ اور وہاں سے تیسری جگہ منتقل کر رہی ہے۔ دھوپ کی تیزی اور آفتاب کی تمازت پورے میدان کو آگ کا نمونہ بنائے ہوئے ہے۔ ریت اڑ کر جب جسم سے ٹکراتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے چنگاریاں لگ رہی ہوں۔ گرم ہوا کے تھپیڑے بدن کو جھلسا رہے ہیں۔ پیاس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ہونٹوں پر پپڑی جم گئی ہے اور زبان باہر نکل آئی ہے۔ پانی کا آس پاس کہیں وجود نہیں ہے۔ میں حیران و سرگرداں، افتاں و خیزاں پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا ہوں۔ بہت دور تالاب نظر آتا ہے۔ میں تالاب کی سمت بڑھتا ہوں اور امید و یقین کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جب وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر جان حلق میں اٹک گئی کہ یہ تو سراب تھا۔ حسرت و یاس اور افسردہ دلی کے ساتھ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ اب یہ بات مقدر میں لکھی جا چکی ہے کہ مجھے بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یہاں مرجانا ہے۔

آنکھیں بند کئے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کانوں میں گھنٹیوں کی آواز گونجی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا کہ سامنے سے اونٹوں کا ایک قافلہ چلا آرہا ہے۔ یہ قافلہ میرے سامنے آکر رک گیا اور لوگ اونٹوں سے اتر کر اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے۔ پھر یہ دل دوز منظر سامنے آیا کہ اونٹ لوگوں کے پیچھے دوڑتے

ہیں۔ درندگی اور بے دردی سے گردن پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہیں اور زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ سارا میدان نعشوں سے پٹ گیا۔ اب اونٹوں نے ان نعشوں کو کھانا شروع کر دیا۔ ایک اونٹ مجھے پکڑنے کے لیے دوڑا اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے آنکھ کھل گئی۔

خواب کی تعبیر جاننے کے ساتھ گزارش ہے کہ آدمی اس قسم کے خواب کیوں دیکھتا ہے اور خواب کا تجزیہ بھی ضرور کیجئے گا۔

جواب: عام حالات میں نگاہ ذہن کی سطح پر جو شبیہیں بناتی ہے اور جن چیزوں کی شبیہیں ہوتی ہیں، ان چیزوں کے اندر گہرائی کا ہونا ضروری ہے، چاہے وہ مثبت مقدار میں ہوں یا منفی مقدار میں۔ خواب میں جتنی شبیہیں ہمارے ذہن کی سطح پر بنتی ہیں، وہاں گہرائی کی مقداریں منفی ہوتی ہیں۔ ان مقداروں کے زیرِ اثر خواب دیکھنے والا تو ان شبیہوں یا شکلوں کو جو اس کی ذہنی سطح پر بنتی ہیں، دیکھ سکتا ہے لیکن دوسرے حضرات جو اردگرد موجود ہوں، دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں کیوں کہ وہ بیداری کی حالت میں ہیں اور بیداری میں مثبت مقداریں ہونا ضروری ہیں، چاہے وہ کم سے کم ہوں البتہ دونوں صورتوں میں خواہ مقداریں منفی ہوں یا مثبت، پس منظر میں کچھ چیزیں ضرور ہوتی ہیں اور ان چیزوں کی نشریات ہی ہمارے ذہن پر شبیہیں بناتی ہیں۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ — مثبت مقداریں منفی میں اور منفی مقداریں مثبت میں ردّوبدل ہوتی رہتی ہیں۔ منفی مقداروں کی تعریف یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی ان حدود سے جو ہماری معین کردہ ہیں، آزاد ہوتی ہیں۔ کائنات میں جو اصلِ اصول کارفرما ہیں، ان کا قرآن پاک میں "معاد" کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ معاد قدرت کی سنت ہے۔

مثال: ایک آدمی جو ہم سے دور پرے کسی دیوار کے پیچھے کھڑا باتیں کر رہا ہے، اس کی آواز ہمارے ذہن کی سطح پر باتیں کرنے والے کی شبیہ بنا دیتی ہے۔ اگر ہم اس شخصیت کا نام جانتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص باتیں کر رہا ہے۔ یہ شبیہ منفی مقداریں رکھتی ہے اور زیادہ واضح طریقے پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کی آواز ریکارڈ کرلی جائے تو ہم اس ریکارڈ کے ذریعے ایک جگہ سے ہزاروں میل دور جاکر مہینوں اور سالوں کا وقفہ گزرنے کے بعد بھی اس آواز کو سن سکتے ہیں۔ یہ آواز ہمارے

ذہن کی سطح پر اسی شخصیت کی شبیہ بنا دیتی ہے۔ اگر شخصیت کا نام معلوم ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کی آواز ہے۔ کہنا یہ ہے کہ کسی شخصیت یا کسی چیز کو پہچاننے کا ذریعہ دراصل اس شخص یا چیز کی شبیہیں ہوتی ہیں خواہ منفی مقداروں میں ہوں یا مثبت مقداروں میں۔

اب ثابت یہ ہوگیا کہ منفی مقداروں میں بھی وہی طاقت ہے جو مثبت مقداریں رکھتی ہیں اور ساتھ ہی وہ مثبت مقداروں کی طرح زمان و مکان کی پابند نہیں ہیں۔

لوحِ محفوظ کا قانون یہ ہے کہ ہر عمل میں عمل کرنے والے کی شخصیت موجود رہتی ہے اور ابد تک موجود رہے گی — اس کو ابدیت حاصل ہے اور کوئی شخص قدرت کے اس اصلِ اصول سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ یہ امر واضح ہے کہ منفی مقداریں زمان و مکان کی گرفت سے بالکل آزاد ہوتی ہیں تاہم یہ حقیقت مشترک ہے کہ دونوں کی بنائی ہوئی شبیہوں میں شخصیت موجود رہتی ہے۔

تعبیر: خواب میں آپ کی بنائی ہوئی شبیہیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اس بات کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں کہ یہ پریشانی پورے خاندان کا احاطہ کر لے۔

تجزیہ: خواب میں اونٹوں کا آدمیوں کو کھانا ایسے تمثلات ہیں جن کے پس منظر میں وسائل کی کمی پائی جاتی ہے۔ ریگستان کا نعشوں سے پٹا ہوا ہونا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ وسائل میں اور زیادہ کمی ہونے کے امکانات ہیں۔ خواہ وہ وسائل ضروریات سے متعلق ہوں یا آسائش سے۔ آپ کے پیچھے اونٹ کا دوڑنا اور آپ کا بچ نکلنا لاشعور کی اس طرف راہ نمائی ہے کہ ان تکلیف دہ حالات سے نجات پانے کے لیے ذبیحہ کا صدقہ دینا مفید ثابت ہوسکتا ہے — یہ ذبیحہ بکرے کی صورت میں ہونا چاہئے۔

جہاز اڑتے ہوئے دیکھنا

تعبیر: اڑتے ہوئے ہوائی جہاز دیکھنا اور پھر انہیں گر کر تباہ ہوتے ہوئے دیکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہوائی قلعے بہت بناتے ہیں جس سے آپ کی شخصیت کا تعمیری پہلو تباہ ہو رہا ہے۔

احرام ملا ہے

(کورنگی): ایک بزرگ تشریف لائے جن کا چہرہ نہیں دیکھ سکی لیکن ان کے ہاتھ پیر بہت گورے گورے اور پتلے ہیں۔ بزرگ کے ہاتھ میں لفافہ ہے جس پر میرے شوہر کا نام لکھا

ہے۔ بزرگ نے شوہر کا نام لے کر پوچھا، آپ ہیں؟ تو شوہر نے جی ہاں میں جواب دیا۔ انہوں نے لفافہ شوہر کو دیا کہ یہ ٹکٹ اور ویزا ہے پھر دو چادریں دے کر فرمایا، یہ آپ کا احرام ہے۔ شوہر نے کہا، میں بہت کم زور اور لاغر ہوں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

بزرگ نے فرمایا کہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہو گی، جب آپ طوافِ کعبہ کریں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر فرمایا، آپ کو فوراً روانہ ہونا ہے، میں پورا انتظام کر کے آیا ہوں۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوبؐ کی رحمتیں آپ پر ہوں۔ خواب کی تعبیر نہایت نور علیٰ نور ہے۔ انشاء اللہ — خواب میں جو دیکھا ہے، وہ ضرور پورا ہو گا۔ اللہ کے گھر اور حضور پاکؐ کے روضۂ اقدس پر حاضری ہو تو مجھ عاجز بندے عظیمی کو یاد رکھئے۔ خواب پڑھ کر الحمدللہ، دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ درود شریف پڑھنے کی بہت فضیلت ہے، اسے جاری رکھئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے، آمین۔

تحریک دینے والا ذخیرہ

انسانی زندگی دو طرح حرکت کر رہی ہے۔ ایک یہ ہے کہ اوپر سے زندگی کے تمام احساسات کا نزول ہو رہا ہے اور دوسرے یہ کہ زندگی میں کام کرنے والے احساسات صعود کر رہے ہیں۔ صعود و نزول کے اس قانون کو جاری و ساری رکھنے کے لیے قدرت نے یہ نظام قائم کیا ہے کہ دونوں وقفے متحرک رہیں۔ محوری گردش کے وقفے خواب میں کام کرتے ہیں اور طولانی گردش کے وقفے بیداری میں کام کرتے ہیں۔ زندگی کی بساط چوں کہ محوری گردش کے وقفوں پر ہے اس لیے طولانی گردش کے وقفوں کا محوری گردش کے وقفوں سے مسلسل اور متواتر ربط قائم رہنا ضروری ہے۔ ہماری زندگی کا یہ معمول ہے کہ ہم سونے کے بعد بیدار ہوتے ہیں اور بیدار ہونے کے بعد سو جانے پر مجبور ہیں۔ انسانی زندگی کا سارا ریکارڈ لاشعور میں ذخیرہ ہے۔ لاشعور سے شعور میں زندگی منتقل ہو رہی ہے۔ اگر ہم خواب نہ دیکھیں تو شعور میں حواس منتقل نہیں ہوں گے۔ ہم خواب اس لیے دیکھتے ہیں کہ شعوری زندگی کی تعمیر کرنے والے حواس میں کام کرنے والی انرجی کا ذخیرہ جب ختم ہو جاتا ہے، وہ لاشعور سے شعور میں دوبارہ جمع ہو جائے۔ اگر ہم خواب نہیں دیکھیں گے یعنی سوئیں گے نہیں تو زندگی کو تحریک دینے والا ذخیرہ شعور میں منتقل نہیں ہو گا۔

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل ومشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین ودنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

ing are deeply significant, a time when the mind is awake yet still untouched by the noise of restless thoughts, resting in the quiet rhythm of the subconscious. Likewise, the moments before sleep are equally important, for it is then that the physical system draws energy from the subconscious.

Whatever thought occupies the mind as we fall asleep imprints itself upon our dreams. The idea that lingers at night is often the one that has walked beside us and circled our minds all day. Therefore, give your subconscious a wholesome thought before sleep, so that this same thought may move within you by day and by night, manifesting its reflection in your life.

All through the day, we tire the body and scatter its strength. At night, the subconscious gathers those scattered threads and lays balm upon our inner wounds. Even illness has its own consciousness. If you are unwell, then before sleep, send this message to your inner self: I am completely healthy. The subconscious will receive this message and deliver it to the conscious mind and the body will follow.

Before sleeping, speak to your subconscious, and after waking, speak to your conscious mind. These are the golden hours of the day. The first thought upon waking creates the energy that shapes your day.

If you wish to bring something good into your life, make it your first thought after waking and your last before sleep. Begin with Bismillah, repeat your chosen thought for ten minutes, and end by saying, "God is All-Powerful."

If you feel that your destiny is unkind, tell yourself: I am the creation of God, who loves me more than seventy mothers combined, and I am the most fortunate person in the world. Your destiny will open its gates, God Willing. Those who grieve over small matters lose their peace. Learn to overlook and let go.

As the Holy Quran declares, "Behold! verily on the friends of God, there is no fear, nor shall they grieve." (Quran,10:62)

If you seek inner peace, ensure that your thoughts and affirmations are free from material desire.

The spiritually awakened rise before the sun. Those who wake with time walk in harmony with it, drawing upon its energy at its purest hour. These people remain fresh and vibrant throughout the day. But those who rise late lose that sacred portion of the day. They then try to borrow energy from the remaining hours, but it never quite fulfills them, and fatigue follows them like a shadow.

To ignore one's inner potential and spend time in worry is true misfortune. Understand the value of time and thought, and learn to draw strength from their boundless power.

V

medicine cannot always reach, the soul can, for where medical science may fail, spiritual science succeeds. Every illness can be healed through the repetition of thought. Thought sends a message to the consciousness, and consciousness, in turn, manifests that message as feeling and experience.

Even for sleep, one should seek help from the subconscious, for sleep is connected to the stillness of the mind. When the mind enters a state of deep focus, it reaches a level of energy that goes beyond the limits of conscious endurance. At that point, waves of sleep gently overtake it, and the rest of life's activities shift into the subconscious. This is a realm we call dreams or imagination. Therefore, send peaceful thoughts to your consciousness, so that it may enter a state of calm and rest.

A psychologist once confessed, "All my life, I guided patients on how to overcome depression, but I never saw anyone truly recover. And now, I myself have become a patient."

A doctor knows that psychological illnesses are rooted in one's attitudes and patterns of thought. To untangle a troubled mind, one needs a supportive environment. Today, every individual seems caught within their own web. How can healing take place when depression lives in the heart, but medicine is given to the brain?

The heart and the mind are not the same. The heart gives commands; the mind carries them out. If the heart continues to beat but the brain ceases to function, the person remains alive. But if the heart stops, the brain falls silent.

People often ask, "Does decision-making come from the heart or from the mind?" It comes from the heart. When the thought of changing a decision arises, we say it comes from the mind, but that too stems from the heart that is now touched by doubt. The relationship between heart and mind is that of ruler and servant. The heart gives command and the mind carries it out.

Whatever thought the mind settles upon with conviction will eventually manifest. This stillness is the essence of certainty. Whether the thought is constructive or destructive, certainty gives it power. Through certainty, we become either healthy or ill, successful or defeated. Therefore, use the strength of certainty not in negative thinking, but in repeating what is positive.

❁ ❁ ❁

The consciousness accepts two things: thought and imagination. Thought is a message from the subconscious, while imagination is the picture of that message. Since thoughts shape circumstances, give your consciousness good messages. There are moments when such messages take deepest root. It is best to send these messages at a time when the subconscious is dominant.

The first few minutes after wak-

Do not repeat, "I don't have diabetes, I don't have diabetes," because the word "don't" carries a negative vibration.

If you wish to remove disease, speak in the language of health. Speak with words that affirm life, strength, and healing.

A young woman was diagnosed with a serious illness. She went to her spiritual teacher and said, "My salary is small, the treatment is costly, and my mother depends entirely on me. What will happen to her if I cannot recover?"

The teacher guided her to use the power of her subconscious mind. He said, "Believe with certainty that the illness is gone and that you are healthy. Say it once with conviction: 'The illness has left me.' After that, never repeat the word "illness" again. Instead, say, "My liver is functioning perfectly." Repeat this thought and feel it. Visualise and see yourself healthy in your imagination."

Six weeks later, she called to share her test results: the disease had decreased by seventy-five percent, and the doctors were astonished.

How unaware we are. We call such happenings wonderworking while in truth, they are manifestations of thought and the power of the subconscious mind that God has placed within us.

Before beginning any work, we often surrender to doubt and fear: I am poor — how will I afford treatment? I need influence to find a job.

Without realising it, we make a silent decision: I will not be chosen; I will not recover. Because of these thoughts, that is exactly what happens. Fear takes the place of faith.

Parents often say: Children these days are ungrateful. Save money, or they might abandon us in old age.

What are they doing? They are unknowingly shaping, through their own thought, the very future they fear.

A so-called wise person advises, "Save money; it will help you in times of trouble."

And so, while money is being saved, trouble too is being invited, and both will arrive together. Why not say instead: Save money to build a hospital; save money to open a school. Must wealth only be gathered for calamity?

We have learnt to call ourselves bad. But when we shift to call ourselves good, the heart naturally lets go of the thought of evil, and others too, start to appear good.

If we speak goodness for ourselves while still judging others as bad, then we have not yet understood what goodness truly is. Despite our repetition, we do not become good.

❁ ❁ ❁

People visit psychologists and spend their lives depending on sleeping pills, seeking peace through medicine. However, what

tion with confidence. I have already been selected. And if they ask about your hobbies, do mention that you meditate."

The next day, the young man went to his interview. Three men were seated before him. "How do you begin your mornings?" they asked.

He replied, "With meditation."

"What kind of meditation?"

He smiled gently. "The kind that makes one familiar with peace."

The atmosphere shifted.

"Then guide us," they said.

The young man set a timer for fifteen minutes and spoke softly, "Close your eyes and take eleven deep breaths." He then recited a short prayer.

When the timer rang, the three men opened their eyes as if waking from a serene dream. One of them asked, "Do you have any other talents?"

"I sing well," he replied.

"Then sing for us."

He sang a song that called the heart to turn towards God with love.

By the end, what began as a formal interview had become a quiet gathering of souls. Soon after, he received his offer letter.

Remember: Repetition of thought is how we communicate with the subconscious. It removes fear and aligns within us those elements that lead to success. But if an undeserving person uses this power of thought merely to gain a position he has not worked for, it will not bring success. For the essence of certainty holds no place for deceit, destruction, or shortcuts. One who has not striven cannot take the place of one who has. Such is the law of certainty.

❁ ❁ ❁

The power of thought can heal pain, and it is thought itself that often gives birth to it.

People say, "I never thought this would happen."

In truth, they had thought, "It will not happen."

The repetition of the word "not" becomes the very cause of its manifestation.

Imagine a woman who keeps thinking every day, "I hope I don't fall ill with a serious disease." What is she doing? She is gathering the very elements of illness through her thought. This is something worth reflecting upon.

Medical experts say that once a person develops high blood pressure or diabetes, they must take medicine for life. The mind accepts this statement as truth and so it becomes true for that person.

But illness is also a creation. It is born, and it dies. We, however, keep it alive by repeating, "Diabetes never goes away."

The subconscious must instead be given a new message: "Diabetes has left my body. I am healthy. The sweetness in my blood is balanced."

intention and when intention is strengthened, it becomes an image. Therefore, never repeat what you do not wish to see. The thoughts you repeated in the past have already grown into trees and are now bearing fruit. The thoughts you repeat in the present are the trees of your future.

Those who think negatively must understand that circumstances are not your enemies. By repeating negative thoughts, you become your own enemy.

Once, a young engineering student came to a man of wisdom and anxiously said, "My exams are only a month away, and I am terribly worried."

The wise man asked gently, "Have you prepared?"

She replied, "Yes, I have studied, but I am so nervous. I keep thinking, what if something unexpected appears in the paper?"

The wise man smiled and said, "There is a force within you called Yaqeen (certainty). Currently, it is asleep, but you must awaken it. You are God's creation, and He has breathed His soul into you. Within that soul lies the knowledge of creation itself. Because of it, you are powerful. You must repeat to yourself: God has power over all things. When you remember God in this way, certainty awakens within you, and the qualities of your soul begin to unfold. Each morning, as you rise, repeat with full conviction five times: I have the ability to solve every kind of question that comes before me."

The student asked in wonder, "Does that really work?"

The wise man replied, "With certainty, everything works."

After her exams, she returned, radiant with joy, and said, "Everything that appeared in the paper was exactly what I had prepared for. It truly worked!"

The wise man smiled and said, "No, it is not that what you wished for came to pass, it is that you were prepared for what arrived. Do not say, 'Let what I want happen.' Say instead, 'Whatever happens, I carry within me the strength to face it.'"

❁ ❁ ❁

In this brief conversation lies a complete curriculum for awakening *yaqeen*. We are not meant to act through the limits of the body, but through the boundless power of the soul.

Many young people worry before an interview, wondering what will be asked, and whether they will be selected.

Once, a young man was preparing for an important role, and went to speak to his spiritual guide first. He said, "In times like this, influence and wealth decide everything. Unfortunately, I have neither."

The guide smiled and replied, "You are capable and sincere. Tomorrow morning, when you wake, say to yourself with conviction: There is a spiritual strength within me. I answer every ques-

i

In Tune with Time

Today, every individual seems caught within their own web. How can healing take place when depression lives in the heart, but medicine is given to the brain?

Thought is energy, and within energy lies the formula of all things. When energy loses its vitality, thought cannot take form. It remains unseen and unmanifest. Whatever we think sends out waves of vibration that ripple through all directions. It is commonly believed that there are only four directions, but when one ascends two steps higher on the ladder of thought, six directions unfold before the inner eye. And when one climbs the entire ladder and reaches the open plain or the roof of awarenss, the distinction of directions fades away. For in that moment, one realises: I myself am the direction; it is through me that directions appear to exist on every side.*

The Golden Principle:

Waves of thought do not spread merely towards the east or the west, nor to the north or south. They do not travel in a single direction; rather, they expand evenly throughout the universe. In that equal expansion, a circle is formed. This circle is the vision that dissolves the very idea of direction.

A human being becomes what they think. But how does thought take form? There are two ways to understand this principle:

1. Ordinary Consciousness

Waves arise from the mind and move outward, drawing things towards themselves like a magnet.

2. Cosmic Consiousness

Whether a thought is positive or negative, it spreads in a circular motion, and it is this circular motion that allows the thought to emerge into form. The circle is the mechanism of creation.

As the Holy Quran declares:

"But to God belong all things in the heavens and on earth: And He it is that Encompasseth all things."

(Quran, 4:126)

❁ ❁ ❁

We live within the embrace of nature. Air, water, soil, fire, light, and all that arises from them, are expressions of nature itself. Whatever we desire, the universe receives it in the form of waves and sets about weaving it into being. These waves travel outward and are held in the atmosphere, where they take shape according to their character. When their proportions are complete, the unseen becomes visible, and the form manifests.

Thought is a creative force. Through repetition, it becomes

* Readers, reflect on this sentence.

request prayer for healing. That night in a dream, he saw that Hazrat Shah Fakhruddin Dehlvi (RA) had arrived and said, "You did not have the strength to come, so I have come myself. Be comforted. You shall recover."

3. Upon waking, the man felt the illness lift and he soon regained full health.
4. One of his disciples owned a guava orchard. A few of the trees had withered. When he mentioned this to Shah Fakhruddin (RA), his master blew a spiritual blessing over water and instructed that it be poured on the roots of the trees. When it was done, the dried trees blossomed and filled with leaves.

Trees, like us, are living beings. They are born and die, breathe, grow, bear fruit, and have family lines. The greening of a withered tree is like life emerging from the lifeless.

5. In Delhi, there came a year when no rain fell. People came to Shah Fakhruddin (RA) and requested he pray for rain. He raised his hands and prayed, "O Lord! Have mercy on Your servants." Soon, clouds of mercy gathered, and rain fell upon the city.

Hazrat Shah Fakhruddin (RA) had a deep love for reading and reflection. His library held a precious collection of carefully chosen books, each one a doorway to wisdom. Among his own writings were: *Nizam-ul-Aqaid*, *Risalah-e-Ain-ul-Yaqeen, Risalah-e-Murjia*, and *Fakhr ul-Hasan.*

In the year 1784 (1199 AH), Hazrat Shah Fakhruddin (RA) departed from this world.

Professor Khaliq Ahmad Nizami, in Tarikh-e-Mashaikh-e-*Chisht*, writes that a day before his passing, a couplet was constantly upon his lips:

Waqt an amad keh man uryan shawam, Chashm biguzaram, sarasar jan shawam.

"The time has come to unveil myself. To break free from the outer world and become the very essence of life itself."

Golden Sayings of Shah Fakhruddin (RA)

- The essence of all worship lies in presence of heart, whether that be through audible or silent remembrance, reflection, or contemplation.
- God has bestowed upon human beings the knowledge of the universe.
- Purify the heart of duality and attachment.
- Selflessness is the gateway to elevated spiritual states.
- Make gratitude your constant emblem.

The friends of God perceive the inner world, understanding the disposition of each soul, and converse according to the intellectual and spiritual capacity of the person before them.

Maulana Rumi (RA) describes this quality in the *Masnavi* with these words:

Bar ma choon aab dar har rang shamil mi-shaved

Translation: Our state is like water, which adapts and blends into every colour.

Shah Fakhruddin (RA) once said, "People come to me with different minds. Some come as scholars, some think of me as a Sufi, some regard me as an alchemist. Some come because of moral guidance, others in pursuit of spiritual practices and recitations. Therefore, my conduct with each is according to the mind and disposition they bring."

(Book: *Fakhr-ul-Talibin*)

Shah Fakhruddin (RA) greeted everyone with love, addressing people as Sahib or Hazrat. He distributed whatever resources came to the khanqah. Whenever he saw someone in distress, he offered help, and he would also advise his disciples to be mindful of the needs of others. He said, "Whatever comes should be spent on the poor. And the day nothing comes should be considered a blessing, for hunger and abstinence have a profound effect on the soul."

It is related that the sweeper of the *khanqah* was absent for two days. Upon learning that he was unwell, Shah Fakhruddin (RA) went personally to his house, gave him money for treatment, and humbly apologised for not having tended to him sooner.

On another occasion, someone attempted to take his life and attacked him. The devotees caught the assailant's hand, but Shah Fakhruddin (RA) instructed them to release it. Bowing his head, he said to the attacker, "I am here. Whatever purpose you have come with; fulfill it."

Overwhelmed by his calm state and compassion, the attacker fell at his feet and begged for forgiveness.

Hazrat Fakhruddin (RA) performed many wonderworking, and a few of those that could be recorded are as follows:

1. While travelling from Aurangabad to Delhi, he met an elderly woman who was blind. Upon learning that he was Shah Fakhruddin (RA), she requested that he pray for the restoration of her sight. Shah Fakhruddin (RA) placed his hands over her eyes, and with the blessing of God, her vision was restored.
2. A man fell gravely ill with no hope of recovery. He told people that if he had the strength to travel, he would have come to Shah Fakhruddin (RA) to

Majnun. I am not a lover of the ordinary kind; my love is different, exalted, and above them all."

Receiving this guidance, Shah Fakhruddin (RA) left Aurangabad and travelled to Delhi. There, he began his work of teaching and guidance. Historians note that Shah Fakhruddin Fakhr Jahan Dehlvi (RA) could not remain unknown in Delhi. Revered through his connection with the Chishti elders, the people of Delhi held deep devotion for him.

After some time, he moved to a *madrasa* (religious school) near the Ajmeri Gate, where he continued his teachings and spiritual work.

In that era, the efforts made to spread the teachings of the Sufi orders have been described by historian and author, Professor Khaleeq Ahmad Nizami (1925–1997) of Aligarh Muslim University, Lucknow. He writes,

"There are two madrasas that are at the heart of Delhi at this time. One is Madrasa Rahimiya, where the court of a friend of God is assembled and the foundation of a powerful revolutionary movement is being laid. The other is the madrasa near Ajmeri Gate, where a young scholar from Deccan has taken residence in the spiritual institution. Almost half a century earlier, this young man's father had been assigned by a renowned Delhi saint to the work of preaching and reform in the Deccan. Today, his son has come from Deccan to Delhi to light the lamp of knowledge and spiritual insight. People gather around him like moths to a flame. There is such a spell of awe in his glance that whoever meets his gaze is drawn to him. This is Shah Fakhruddin (RA). His father, Shah Nizamuddin Aurangabadi (RA), was the most devoted disciple and khalifa* of Shah Kaleemullah Dehlvi (RA), and it was by his orders that he had gone to Deccan."*

(Book: *Tareekh-e-Mashaikh-e-Chishti*)

People began to flock to Shah Fakhruddin Fakhr Jahan Dehlvi (RA) for *bayt**. Among them was Sheikh Noor Muhammad Maharwi (RA), who became his first spiritual successor and later spread the Chishti order in Punjab during the eighteenth century.

There is a saying in Persian, "Speak to each person according to their temperament, interests, and inclinations. Speak of knowledge to the scholar, of warfare to the soldier, and of alchemy to the alchemist."

*Madrasa Rahimiya: It was founded by Shah Abdul Rahim Dehlvi (RA), the father of Shah Waliullah (RA). *Khalifa: Successor

*Bayt: It is a sacred pledge or spiritual covenant between a spiritual guide and disciple.

When the spiritual vision ended, five grains of *Banni* were in his hand. Upon seeing this, his father said that his portion was also included, and together they partook of the blessed grains.

Like every saint, Shah Fakhruddin (RA) was a devoted lover of the Last Prophet - Muhammad (PBUH). He earned the title '*Muhib-un-Nabi'*, meaning, 'The Lover of the Seal of the Prophets – Prophet Muhammad (PBUH).'

The reason for this title is narrated in two accounts:

He was present at the shrine of Khwaja Nasiruddin Dehlvi (RA). He saw that the saint of the shrine offered him some food from the *langar* and said, "You are a lover of the Prophet (PBUH)."

Another account mentions that when he visited Ajmer Sharif, a spiritual seer present there was blessed to receive a vision of *Sultan-ul-Hind*, Khwaja Gharib Nawaz (RA). The *Sultan* pointed towards Hazrat Fakhruddin (RA) and said, "Recognise him. His title is *Muhib-un-Nabi*."

Hazrat Fakhruddin (RA)'s father, Shah Nizamuddin Aurangabadi (RA), was himself a saint of God. Guided by the glad tidings of his spiritual master, Shah Kaleemullah (RA), he devoted great care to the education and upbringing of his son. For worldly knowledge, he placed him under the guidance of the most renowned teachers of the time, while personally overseeing his inner, spiritual training. When Shah Nizamuddin Aurangabadi (RA) departed from this world, Shah Fakhruddin (RA) was 16 years old.

After completing his studies, he joined the army. But being a dervish at heart, solitude would draw him inward, deep into the spiritual realm. For a time, he tried to hide this disposition, but when concealment became impossible, he resigned and returned to Aurangabad.

Wherever friends of God dwell, their spiritual magnetism spreads far and wide. Upon returning to his ancestral city and making his father's *khanqah* (spiritual school) his home, news of his presence spread, and a crowd began to gather. By temperament, he sought solitude, and hence he considered leaving. Yet leaving Aurangabad was not easy. There lay the shrine of his father and spiritual guide. The thought of departing weighed heavily on his heart. In the midst of this inner struggle, he saw a vision of his father in a dream, reciting these lines:

Shah-e-aqlim-e-faqram, bekhudi takht-e-rawan-e-man
Na choon Farhad mazdooram, na choon Majnun zamin daram

Translation: "*Faqr** is my kingdom, and selflessness is my throne. I am neither a labourer like Farhad, nor a landowner like

**Faqr : The sacred state of being free from all but God.*

i

Green Returns to the Branches

"Whatever comes should be spent on the poor. And the day nothing comes should be considered a blessing, for hunger and abstinence have a profound effect on the soul."

It was the eighteenth century in Delhi. The Mughal era, lost in its own indulgence, was in its final throes as it turned away from reform and progress. Everywhere, there was unrest and moral decline. The affairs of the empire were in disorder, and the conditions of the people were unfavourable.

Goodness always exists to counteract evil, and negative forces expend their energy to distract from virtue. In those times, when the Mughal rulers neglected their responsibilities, the friends of God were busy guiding, reforming, and serving humanity. Among these venerable souls was Shah Fakhruddin Fakhr Jahan Dehlvi (RA), who kept the lamp of reform burning bright in those times of strife, and delivered to people the message of the love for God.

Shah Fakhruddin Dehlvi (RA) was born in 1717 CE (1126 AH) in Aurangabad. His father, Shah Nizamuddin Aurangabadi (RA), was also among the revered saints of God. His mother, Bibi Syed Begum, belonged to the family of Hazrat Syed Muhammad Gesu Daraz (RA).

When Shah Kaleemullah Dehlvi (RA) received news of the child's birth at the home of his disciple, Shah Nizamuddin (RA), he named the boy Fakhruddin and sent his own robe as a gift for the newborn. This was an act of spiritual guardianship. He also foretold that the child would grow to be a person of firm faith. Shah Fakhruddin (RA) recounts:

> *"The letter that Hazrat Sheikh (Shah Kaleemullah RA) wrote to my father after my birth is still with me. It contains many glad tidings about my life. God has showered His mercy upon me. In that letter, Shah Sahib (RA) also mentioned I would light the lamp of guidance and righteousness in Shahjahanabad."*

When Shah Fakhruddin Dehlvi (RA) was seven years old, he was blessed with a vision of the Last Prophet – Prophet Muhammad (PBUH). Historians record that one day, while he was pressing his father's feet in devotion, a drowsiness overtook him. In that state, a radiant vision unfolded before him: he saw the Prophet (PBUH) granting him five grains of *Banni**.

* *Banni: Grains given to labourers in the fields as wages.*

V

new environment.

In the same way, the 'hormones" that enable harmony within society are good character, peace, patience, compassion, love, forgiveness, and a connection with God. Spirituality refines a person's attitude so that a healthy and balanced society may come into being.

A few young people were unable to adapt to society and said that living among people made peace impossible. They left their community and joined an institute where mental calmness and meditation were taught.

But if one reflects, they had left a community only to enter another one, which was the institute itself. In doing so, they gathered together and formed yet another society.

Like every society, the institute had its own system and way of functioning. In this new environment, they soon realised that living there was even more difficult. Though people lived side by side, each wished to remain distant and apart.

After seven months, their sense of deprivation and disillusionment deepened. "After spending time here, we are far more hopeless than we were before." Eventually, they left the institute altogether.

A human being is bound by needs. Wherever one goes after leaving society, another society is already there. When a person cuts themselves off from friends and relatives, they soon meet new people and form new bonds. One may have come in search of peace, but if peace does not dwell within, they will leave that place as well.

And what is peace? It is to refrain from interference, to avoid forming opinions, to accept what is happening, to live within society yet never abandon one's path or purpose.

We have given precedence to outward laws over inner ones. To attain peace, religion teaches us to let go of mental illusion, and yet we have mistaken this to mean abandoning the world. The outer world is an illusion, but the foundation upon which the world rests is real. Therefore, do not renounce the world itself; renounce the illusion through which you perceive it. For just as the cloud lives within the paper, so too does truth dwell within all that appears before us.

Peace does not come from leaving people or places. It comes when a person stops running from the inner voice. When one becomes still inside, mind is focused, the path becomes clear, and the truth quietly unveils itself.

Then, in a calm and deliberate tone, he continued, "To be a mathematician one must first be a dancer, and a dancer can only be one who is a calligrapher.'"

Dear readers, every field of knowledge is connected to all others. The challenge before you is to uncover the connection the minister spoke of–The thread that weaves all these arts into one continuous whole.

The purpose of spirituality is to acquaint people with the laws of nature. In every aspect of creation, nature has woven the thread of interconnectedness. Then why has it come to be believed that one must forsake the world to walk the spiritual path?

Spirituality does not demand renunciation of the world, only of illusion. It calls upon us to free the mind from the veil of delusion. We mistake illusion for reality and imagine that to enter spirituality, we must withdraw from society. Yet the Prophets of God (PBUH) walked the path of truth while living within society. They learned to dwell among people without letting their inner peace be disturbed. Had they turned away from the world, how would their message have ever reached others?

Our troubles, worries, ideas, emotions, and fears all are reflections of the society we live in. It is through them that a person becomes a walking image of the society. Recognise your connection with all. Whether you are alone or in a distant wilderness, every action you take stirs vibrations within your being that ripple across the universe.

To sever ties with people is to go against nature itself. When an individual's problems are resolved, the problems of society begin to heal, and when the heart of one person is restless, that restlessness spreads throughout the world.

Leaves grow from a tree, yet they also play a vital part in its growth. Within them, the raw sap combines with water, minerals, sunlight, and air, transforming into a life-giving fluid that nourishes the tree.

In the same way, the individual emerges from society, and society, in turn, grows through the individual. On one side, a person plays the role of a child, and on the other, that of a parent. It is by walking alongside all that one helps society move forward.

Leaves remain connected to the tree through its trunk and branches and whatever links two things together holds great importance. Thus, the trunk is vital, and in society, every individual plays the role of either a trunk or a branch that sustains the whole.

A gardener knows that grafting or transplanting plants is not always easy. Some plants do not adapt readily to new soil, so a kind of plant hormone is used to help them adjust and grow in their

iii

If each of these elements were to return to their origin — the clouds to the sky, the air to the winds, the sunlight to the sun, and the essence of the tree back to the tree — then what we call paper would no longer remain.

It would dissolve into the very sources from which it once arose.

Every creation is a manifestation of the universe in a particular form. All cosmic elements unite in varying measures to appear in different shapes and expressions of existence. The sun, the air, the water, the trees, and the atmosphere: each in its place, is a defined manifestation of the same universal elements. Each is but a smaller or greater form of the cosmos itself. If the dynamic elements that make up the sun were to return to their original abode, what would remain of the sun's existence? The sun, too, exists only through the gathering of these elements.

Like paper, a human being too is a union of elements. What is there in the universe that is not also within man? Nearly seventy percent of the human body is water and within water dwell all the colours that paint the universe.

The purpose of these examples is to show that nothing here exists as a solitary being. Every form is both the expression of its own kind and the gathering of countless others. So, when a person leaves society in search of solitude, he discovers that wherever he goes, another form of society already exists there. For life is forever collective, in every realm.

Everything in existence is interconnected. To help his students grasp this truth, a teacher narrated the story of a king and his wise minister.

One day, the king said to his minister, "I wish to learn the art of calligraphy." The minister replied, "Your Majesty, to master calligraphy, one must first learn to dance."

The king said, "Very well, then teach me to dance."

The minister bowed and said, "As you command, but to learn the art of dance, one must first be a painter."

The king agreed, "Fine. I will begin with painting then. Find me the finest painter in the land."

The minister smiled and said, "My lord, the trouble is… to be a painter, one must first be an architect."

The king grew irritated but restrained himself. "So be it," he said. "Bring a skilled architect to the palace."

The minister paused for a moment, then added, "Your Majesty, an architect can only be one who understands mathematics."

The king laughed and said, "Very well! Everything must begin somewhere. I am ready to become a mathematician."

At this point, the teacher paused, letting the story sink in.

places, and moments that mirror our own state of being. Our tragedy is that we do not consider that others are also a creation of God. We call our withdrawal from humankind "solitude" whilst seeking peace by fleeing, forgetting that we too are human. To leave the world of mankind is to walk away from the essence of being human itself. The real task is not to leave society, but to find stillness within one's own heart. The true purpose is to live among people without losing inner peace.

The Holy Quran teaches us that within creation, the idea of individuality is but an illusion. Nothing exists alone. Every being is bound within the circle of collective life. This Divine law is etched into the essence of all that has been created. What we see as writing upon a page is, in truth, the expression of many unseen elements. The paper is not merely paper, it is the coming together of countless parts that are in themselves, something else. So too is mankind: a composition woven from elements that do not belong to mankind by nature. In reality, what seems solitary is a harmony of many. If you are a poet, you might see a drifting cloud upon a plain sheet of paper. Without clouds, there is no rain, and without rain no trees, and without trees, there can be no paper. Therefore, to see a cloud upon paper is not a supernatural vision. The paper depends upon the tree, and the tree upon water, and somewhere between the paper and the cloud lies their shared essence, whispering of the unity that binds all creation.

This chain of connection does not end here; it extends into every aspect of life, even the light that nourishes all things.

All creation depends on sunlight for growth and nourishment. Plants for instance, thrive through photosynthesis—it is by the sun's rays that nourishment is formed for the green life of the earth. These plants grow into trees, and trees gather to form forests. From these forests spring countless means of livelihood; thus, all existence, in one way or another, is sustained by sunlight.

The poet saw a cloud upon the paper. If you wish, you may see sunlight there. Look deeper still, and beyond the cloud and the sunlight, you can see that within that same sheet of paper, there is a reflection of everything that exists in the universe.

In truth, the paper itself is nothing but a union of elements that are, in reality, not paper at all. This is a quiet reminder that nothing in creation stands alone.

It is fascinating to note that the cloud is not paper, the sunlight is not paper, the water, the wood, the resin, nor the air; none of these are paper. Yet through their coming together, paper comes into being.

i

Written by You

Everything in existence is interconnected. To help his students grasp this truth, a teacher narrated the story of a king and his wise minister.

A man entered the khanqah (spiritual school) with a sense of accomplishment and said to the dervish, "I have left my home, my family, and society behind to learn the knowledge of the inner self."

The dervish looked at him and replied gently, "Go back the same way you came."

The words struck him like lightning. Startled, he asked, "Do you not wish me to find peace?"

The dervish said, "This is not the place you are searching for. You have come here to abandon the world in order to gain knowledge — but this place too, is a world. It is a living society of its own."

The man fell silent, lost in the depth of those words.

From this simple exchange arises a question that echoes through the ages; must one leave the world to find peace within?

There is a common misconception that to walk the spiritual path one must renounce home, family, relationships, and the entanglements of society. The implication is that inner awakening demands complete detachment from the world.

Seeing people devoted to inner pursuits, my friends often ask me, "So, you've decided to renounce the world? Will you live in the wilderness or make the mountains your dwelling?"

My answer is simple: "The city is a forest too, and I am learning to live within it."

True spirituality does not call us to flee from society. It teaches us how to live meaningfully within it. It teaches us how to be conscious, compassionate, and whole amidst the noise and movement of life. The notion that peace lies in escaping the world or severing relationships is born of misunderstanding. In the entire universe, only God is One and Singular; everything else exists in multiplicity.

Each human being is a union of two layers; the outer and the inner. Even in solitude, one is never truly alone as one carries both aspects within. Those who retreated to forests, mountains, and caves in search of peace and enlightenment did not abandon the world, they merely changed their surroundings. Even there, they remained among creation, learning harmony from the silence and rhythm of life around them. The truth is, there is no place in this world that lies outside the world. Wherever you go, the world goes with you.

Everywhere we go, the world reflects itself through people,

iii

Dear readers, there is a space that nature has created, and another that is the illusion woven by a disobedient mind. God Almighty says in the final heavenly book, the Holy Quran:

> "And Whatever hardship befalls you is the result of your own deeds. God pardons many of your sins." (Quran, 42:30)

When one turns away from the space of nature, they dwell within the space of distance, division, and separation. What then, is the space of nature? One reflection of it is the world of Paradise, where resources are countless and the thought of division within space does not exist. The prevailing space in Paradise presents trees as trees, flowers as flowers, rivers as rivers, and comforts as comforts, but the mind does not become divided upon seeing them. This is because, in Paradise, the mind is centered upon the Supreme Being which is One. The perspective of the dwellers of Paradise is obedience to God's command, submission to His will, and the feeling of closeness to Him who has created both us and the resources of our sustenance. On earth, however, people focus on the resources themselves, and thus the mind becomes divided.

How are angles formed? When the mind gives importance to a thing, every object becomes an angle. Even the act of considering it important is itself an angle; the very perspective through which it is seen. In this way, countless angles are created. But when a person turns their attention toward the Creator, things continue to exist, yet the angles of illusion begin to break. What remains is a single prevailing thought — the thought of God.

> "Then set your face upright for religion in the right state — the nature made by God in which He has made men; there is no altering of God's creation; that is the right religion, but most people do not know." (Quran, 30:30)

Respected ladies and gentlemen, the *'Message of the Day'* is a flowing ocean, filled with pearls of truth. Wave upon wave, thoughts rise and unfold, revealing the hidden secrets within their depths. These secrets are shared with you.

May God protect you.

ii

The Creator of night and day, God, says:

> "Thou makest the night to pass into the day and Thou makest the day to pass into the night, and Thou bringest forth the living from the dead and Thou bringest forth the dead from the living, and Thou givest sustenance[3] to whom Thou pleasest without measure." (Quran, 3:27)

For those who reflect on the coming and going of night and day, there are signs. Consider this and open the doors of insight. When day emerges from night, is it separate from night? When night appears within the day, has it become separate from the day? The light that illuminates night and day is one. When a person perceives it in limited patterns, it is called day; when perceived in unlimited patterns, it is known as night.

What are night and day?

Look towards the horizon. When we move away from the sun, we say that night has come. When we draw relatively closer to the sun, we say that day has appeared. We live within such nearness and distance, whose meanings differ for other beings living on the same earth. Each one's observation is different, and neither is correct, because we are not seeing within. We see the earth moving away from the sun, we see the earth moving closer to the sun. But where does the sun receive its light from? The mind does not pay attention to it.

Every setting sun carries a message: when you look at me, you are deceived into thinking I am bright. If the sun is truly bright, and if its light held its own heat, then how does the eye rest upon it at dusk, but during the day, even a few minutes of looking at it affects the vision.

A person looks at the sun but does not see the angles of the earth's rotation around it. When the part of the earth we dwell upon moves away from the sun, where does the warmth and brightness of sunlight that we feel in it go? Does this not reveal that the sun itself is not bright, but the earth is bright? At the angle it faces the sun, the Earth reflects sunlight back toward the earth, and as the part of the earth where we or anyone resides moves away from the sun, the reflection from the sun becomes almost non-existent for that region. The part of the earth that faces the sun is what we call day and the part far from the sun is understood as night. The inner eye sees that the sun is not bright but the earth is bright, and it is the earth that makes the sun appear illuminated. What is all this then? Is it the division of angles, or the angle of division, that forms vision into a view?

• • ——————————— • •

[3] *Resources — and within resources, knowledge is included.*

i

Message of the Day

When a person walks, the movement of the earth aligns with the rhythm of their steps in harmony with the state of their mind, and they perceive that movement in proportion to their level of awareness. While walking, attention does not turn to the fact that space is being divided, yet it is. Without the division of space, no journey can take place. One step is taken, then another, and the distance between the two steps becomes the person's journey. They describe this journey in the patterns of time and distance, moving through space and calling it time, though time itself is not distance. Within time lies nearness. It is the workings of space that entangle a person in distances, creating the illusion that much time has passed. But where has time passed? It is lost in the labyrinths of space.

What is space? Everything that exists is space. Reflection on the definition of space reveals that even the space which seems empty is nothing but space, this is why it appears empty. Space is a dimension that shapes emptiness[1] into distance and forms a shell around it. A person, deceived by the shell, gives it various names, while the shell is empty from within[2]. All of this is the working of space.

Another way to describe this is that the limited mind is nothing more than the division of space and distance. The space that appears undivided is considered empty, and the space seen as fragmented into pieces is given a name. This happens because a person experiences life through patterns of division. If you rremove the hands of the clock, time still exists, but beyond a person's way of defining it. Time exists in such a way that whether the clock's hands move or not, life flows towards the same direction from where it originated.

• • ——————————— • •

An example of the division of space is the alternation of night and day. God wraps the night into the day and the day into the night. From the night, He brings forth the day, and from the day, He brings forth the night, and He acquaints whomever He wills with timelessness.

---

[1] *Emptiness: that which we mistake for nonexistence.*

[2] *The shell is empty from within means it has no movement of its own. It only serves as a medium that shows distance.*

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	136
Written by You	• • •	133
Green Returns to the Branches	Muhammad Usman	128
In Tune with Time	Gul-e-Nasreen	123

"The subject tonight is the Love of God, and for tomorrow night as well. As a matter of fact, I know of no better topic for us to discuss until we all unite with the Beloved."

— *Hafiz Shirazi*

Vol13 Issue11 | December 2025 | Jumada-al-thani _ Rajab 1447AH

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor
Hazrat Khwaja Shamsuddin Azeemi[RA]

Editor
Aisha Khan

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.140/- Per issue. Annual subscription Rs.2100/- with Reg. Post (Domestic), US$ 75/- (International)

Contact: B-113, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020

DENTAL innovations CLINIC

Happy Smile

The secret of the Beautiful Smile

Whiter than White .....!!

Center of excellence for Braces & Dental implants

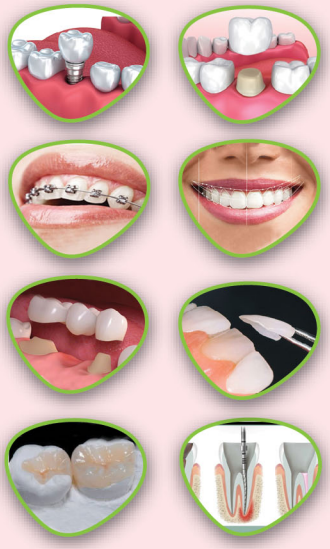

Aesthetic Dentistry
Teeth Whitening, Porcelain Crowns, Veneers, Ceramic Restorations

Restorative Dentistry
Root Canal Treatment, Crown & Bridge

Orthodontics
Fixed & Invisible Braces

General Dentistry
Extractions, Fillings, Dentures

Preventive Dentistry
Pit Fissure Sealants, Root Planing

Minor Oral Surgery
Impactions, Cyst, Apicoectomy

Pediatric Dentistry
Space Maintainers, Steel Crowns

DENTAL INNOVATIONS CLINIC

Mezzanine Floor AKU Lab 26th Street
BADAR Commercial Phase V, DHA, Karachi
dentalinnovations747@gmail.com | www.dentalinnovationsclinic.com
Dental Innovations Clinic
0300-8511747 | 021-37242559 | 021-35242559

New Homes For Sale in Multan & Lahore

For More Details : +92 345 4121 910

FL 5 & 6, Block B, Gulshan-e-Jamal
Rashid Minhas Road, Karachi.

f: lavishdinerestaurant

Lavish Dine
Restaurant

www.lavishdinerestaurant.com

- Party up to 400 Persons
- Affordable Party Menus
- Buffet
- À la carte

Ph: 021-34570423
Cell: 0333-3538004

Azad Kashmir

SANGAM HOTEL MUZAFFARABAD

HOSPITALITY IS OUR TRADITION

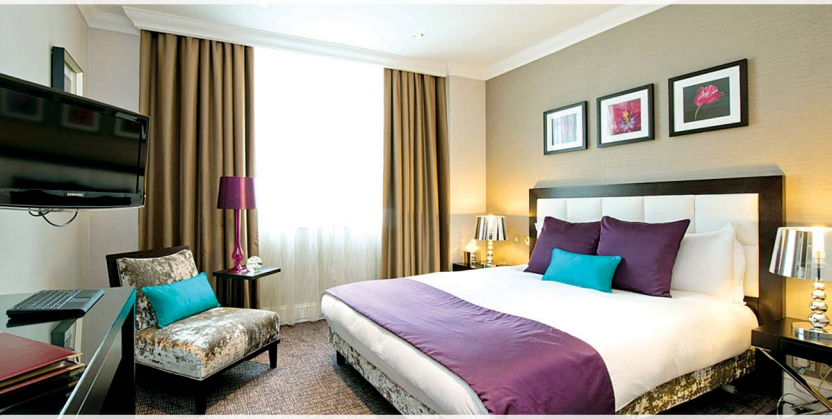

We serve famous delicious Cuisines, offer Air conditioned Rooms, Suites, well equipped Wedding and Conference hall and great Customer service.

Phone No: +925822444194-5 Fax No: +925822442587

Email:sangamhotel@hotmail.com

دنیا کے بڑے کاروباری مراکز میں سے ایک

دبئی میں اپنے کاروبار کا آغاز کیجئے

کمپنی رجسٹریشن سے ویزا حصول تک
تمام مراحل کی باسہولت اور تیز رفتار تکمیل کے لئے قابل اعتماد نام

اسٹور ویب	ریسٹورنٹ	ای کامرس	ٹریول اینڈ
ڈیویلپمنٹ	ٹریڈنگ	آئی ٹی سروسز	ٹورازم
امپورٹ	ہوٹل	کنسٹرکشن	ایمیزون
ایکسپورٹ	ٹرانسپورٹ	رئیل اسٹیٹ	آن لائن

FREEZONE LICENSE PACKAGE
AED22500

PACKAGE INCLUDED

BUSINESS LICENSE
FLEXI DESK
INVESTOR VISA
EMIRATES ID
MEDICAL REPORT
E-CHANNEL PORTAL

RB
RED BERRY
CORPORATE SERVICES

ہر وہ کاروبار جو آپ کی ضرورت ہے!

1408, Opal Tower, Business Bay Dubai UAE
info@redberry.ae | +971 50 931 0752
www.redberry.ae | +971 56 336 9852

/BUSINESSINDUBAI.AE/ /company/redberryae/ /red_berry_corporate/

TOYOTA

the all new

TOYOTA YARIS

DYNAMIC FRONT BUMPER & GRILL

SLEEK DAY TIME RUNNING LIGHTS

STYLISH MACHINE FACE ALLOY RIMS

RETRACTABLE SIDE VIEW MIRRORS

LUXURIOUS BLACK INTERIOR

9" FLOATING DISPLAY WITH APPLE CARPLAY & ANDROID AUTO

SHARP REAR CAMERA

3 AIR BAGS

PUSH START

Move your world

FOR BOOKING & DETAILS PLEASE CALL:

UAN: (022) 111 555 121 or 0348-111 9705

TOYOTA HYDERABAD MOTORS SITE, AUTO BHAN ROAD